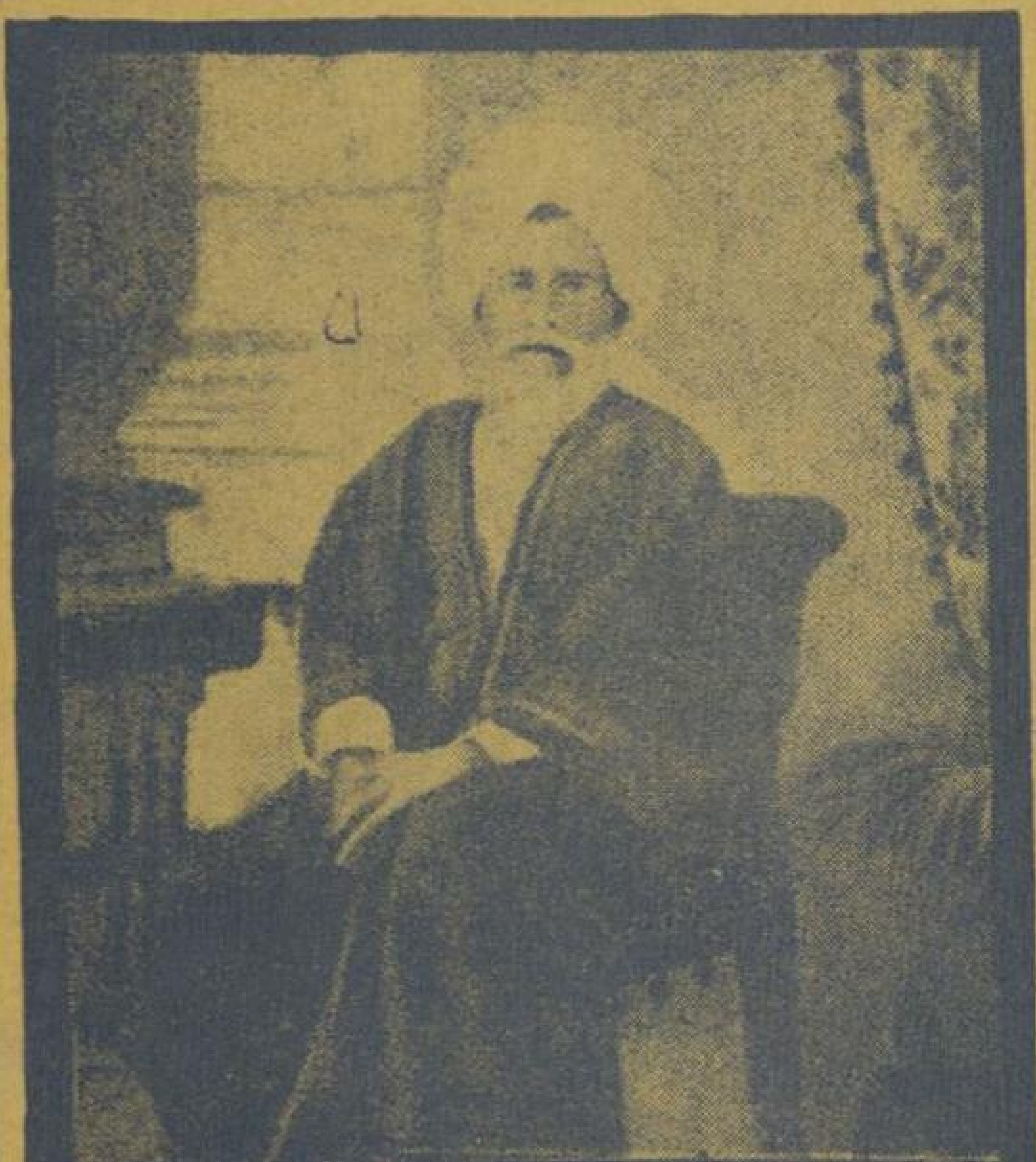
مطائباتِ شبلی



"میں وہی شبلی نعمانی ہوں"

ایس جالب مظاہری

علوی بک ڈپو بمبئی

مطایباتِ شبلی

ایس۔ جالب مظاہری

علوی بکڈپو۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۶۳ء
تعداد ایک ہزار
قیمت 2/50

نیو قادری پریس ۹۷، مورلینڈ روڈ - بمبئی ۸ میں چھاپی گئی

پبلشر:-
علوی بک ڈپو- محمد علی روڈ- بمبئی ۳

فہرست مضامین

پیش لفظ

یوں تو قدرت ہر انسان میں بہت سی صلاحیتیں ودلیعت کرتی ہے مگر کم لوگ ہیں جو ان میں سے کسی ایک صلاحیت سے بھی پورا پورا کام لیتے ہوں۔ شبلی ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں، جنھیں قدرت نے مختلف قسم کی صلاحیتیں بڑی فیاضی سے عطا کیں اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ انھیں ان میں سے بہت سی صلاحیتوں کو بروےکار لانے کی توفیق ہوئی۔ شبلی بڑے ذہین تھے۔ بچپن ہی سے ان کی ذہانت ظاہر ہونے لگی تھی۔ شبلی کی تعلیم کی ابتدا، جیسا کہ اس زمانے کا رواج تھا، گھر اور پھر مکتب سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے حصولِ علم کی غرض سے دُور دُور کے سفر کیے اور بہت کم عمری میں یعنی اس وقت جب کہ ان کی عمر انیس سال سے بھی تجاوز نہ کر پائی تھی فارغ التّحصیل ہو گئے۔ جس قدر ان کی عمر بڑھتی گئی اور ان کا علم وسیع ہوتا گیا، اسی قدر اُن کا ذوقِ علم بڑھتا گیا۔ بہت جلد اُن کا شمار ہندوستان کے جیّد عالموں میں ہونے لگا۔ مگر شبلی صرف ایک عالم یا محقّق نہیں تھے کہ اپنے خیال کی گتھیوں میں کھو جاتے، وہ ایک معلّم بھی تھے اور طرزِ جدید کے مطابق تعلیم دینا چاہتے تھے، وہ طرزِ تعلیم کی اصلاح چاہتے تھے۔ وہ "ندوہ" کو ایسی درس گاہ بنانا چاہتے تھے، جہاں کے فارغ التّحصیل طلبہ علومِ مشرقی کے ساتھ علومِ مغربی سے بھی بہرہ ور ہوں۔ تاکہ وہ اپنے افکار سے نئی روشنی کے شیدائیوں

کو بھی متاثر کر سکیں۔

شبلی ایک جیّد عالم ہی نہیں تھے بلکہ ایک مایۂ ناز مصنّف بھی تھے۔ شبلی اگر صرف عالم ہوتے اور درس وتدریس ہی کو اپنا مشغلہ بناتے تب بھی ملک و قوم کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ ہوتا، مگر اس طرح ان کا دائرۂ عمل چند متعلّمین تک محدود رہتا۔ لیکن وہ ایک مصنّف بھی تھے اور مصنّف کا فیض، زمان ومکان کی حدود سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔ پھر شبلی کی دلچسپی علم کی کسی ایک شاخ تک محدود نہ تھی، ان کی دلچسپیاں بہت وسیع تھیں۔ وہ ایک مورّخ تھے اور تحقیق وتدقیق کے دلدادہ چنانچہ وہ ایسی تصانیف یادگار چھوڑ گئے ہیں کہ برسوں تک کوئی تاریخی کتاب اس درجہ کی نہ لکھی جا سکے گی۔ ان کی کتبِ تاریخ آئندہ مورخین کے لئے شمعِ ہدایت بنی رہیں گی۔ اُنھوں نے "مشاہیرِ اسلام" کے نام سے کتبِ تاریخ کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ "المامون" اور "الفاروق" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سوانح نگاری میں "سیرت النبیؐ" ان کی ایسی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس پر اردو زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

شبلی صرف ایک مورّخ ہی نہیں تھے وہ ایک فلسفی بھی تھے "الغزالی" اس کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

کم فلسفی ایسے ہوئے ہیں جو نقّاد بھی ہوں، مگر شبلی ایک بلند پایہ نقّاد بھی تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف تنقید کا حق ادا کیا بلکہ اردو زبان میں تنقید نگاری کی عمدہ مثال پیش کر کے آنے والوں کی راہ نمائی کی۔

کہتے ہیں کہ اچھا نقّاد کبھی اچھا مصنّف یا شاعر نہیں بن سکتا، مگر شبلی

ناقد ہونے ہوئے ایک زبردست شاعر بھی تھے۔ ہر چند ان کے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ کہا صرف اسی کی بنا پر شاعری میں ان کا درجہ مُسلّم ہے "عدلِ جہانگیری" کے عنوان سے جو نظم اُنھوں نے لکھی ہے اس میں جس بلاغت کے ساتھ اُنھوں نے نفسِ واقعہ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ یہ مختصر سی نظم اسی موضوع پر لکھے ہوئے پورے ناول یا مثنوی پر بھاری ہے۔

کہتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ فطری ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ملکہ ان میں بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ شاید یہ شاعری کا ہی فیضان تھا کہ وہ ایک قدامت پسند قیل وقال کا پابند مولوی نہیں بنے ورنہ اُن کی ابتدائی تعلیم، اُنھیں ایک بدترین خشک بنا دینے کے لیے کافی تھی۔ ان میں مذہبی تنگ نظری نام کو نہ تھی۔ برخلاف اس کے وہ قومیت کے علم بردار اور ہندو مسلم اتحّاد کے زبردست حامیوں میں سے تھے غرض شبلی ایک انسان تھے۔ اور جامعِ کمالات اُن کی دلچسپیاں نہایت وسیع تھیں۔ علاوہ ازیں ان کی ذات میں قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کا نہایت حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔

شبلی کے کمالات سے قطع نظر کرکے، جب ہم اُن کے عادات واخلاق پر غور کریں تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ شبلی بڑے نفاست پسند تھے۔ اُنھیں صرف گھر اور لباس ہی کی صفائی کا خیال نہیں تھا بلکہ اس زمانے میں جب کہ کتابوں کے حسنِ ظاہری پر کوئی ذرا سی توجہ نہیں کرتا تھا، وہ کتابوں میں بھی حسنِ صورت کے دل دادہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کتابت اچھّی ہو۔ پیراگراف اور ابواب کا خیال رکھا

جائے، کاغذ نفیس ہو اور جلد دیدہ زیب۔

شبلی کی آمدنی گو کثیر نہ تھی، مگر وہ بڑے —— دریا دل واقع ہوئے تھے سچ تو یہ ہے شبلی نے کبھی حصولِ زر کو مطمحِ نظر نہیں بنایا۔ اپنے اہل وعیال کے لئے مال وزر چھوڑنے کی بجائے وہ سارے ملک کے لئے تصانیف کا ایک لازوال خزانہ چھوڑ گئے۔

دولت کی کمی نے ان میں کوئی احساسِ کمتری پیدا نہیں کیا۔ بڑے بڑے امراء اور روسار سے ان کی برابری کی ملاقات تھی۔ ان میں خودداری غضب کی تھی جس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ وہ اپنی قدر جانتے تھے۔ مگر ساتھ ہی وہ اوروں کے بھی قدر شناس تھے وہ جانتے تھے کہ علم وادب میں ان کا کیا مقام ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی اور مولوی الطاف حسین حالی کے تبحرِ علمی کی دل کھول کر اُنھوں نے داد دی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد ان سے عمر میں بہت کم تھے مگر شبلی کی ایک حد تک ان سے بے تکلفی کی ملاقات تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے جوہر شناس تھے۔ ان کا سلوک اپنے شاگردوں سے نہایت مشفقانہ ہوتا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے بڑی دوستی تھی۔

علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں اگر ان کی حق گوئی کی مثالیں ملتی ہیں تو ریاستِ حیدر آباد کے دورانِ ملازمت میں خوشامد پسندی اور درباری سازشوں سے تنفر کا حال معلوم ہوتا ہے۔

شبلی میں جہاں اور اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ پائے جاتے تھے

وہاں شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اُنھوں نے عالم دین ہوتے ہوئے بھی کبھی اپنے آپ کو فرشتہ صفت ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی وہ ہر موقعے پر ایک انسان کے روپ میں دکھلائی دیتے ہیں اور غالباً یہی بات ہے کہ ان کی ذات میں ہر ایک کے لئے کشش پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے نہایت دقیق علمی اور تاریخی مباحث پر قلم اُٹھایا، لیکن اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ ہلکی ظرافت کی چاشنی ملتی ہے۔ یہ ظرافت اس قسم کی نہیں ہے کہ کوئی قہقہے لگانے لگے۔ بس صرف ایک ہلکا سا تبسّم ہونٹوں پر آجاتا ہے اور دماغ کو ایک طرح کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات کبھی تو شوخیٔ تحریر سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی اندازِ بیان کی ندرت سے اور کبھی بلاغتِ کلام سے جس میں رمز اور اشارے سے کام لیا ہے۔

میں نے بڑی کاوش وتلاش کے بعد شبلی کی مختلف تصانیف اور ان سے متعلق لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین سے اس قسم کی مثالیں جمع کرکے اس مجموعے کو ترتیب دیا ہے۔ شبلی کے تبحرِ علمی پر تو بہت کچھ لکھا جاچکا ہے جس سے ان کے جامعِ کمالات ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مگر ان کی شخصیت کے اس پہلو کو کہ وہ ایک زندہ دل انسان بھی تھے بہت کم اُجاگر کیا گیا ہے میں نے اس تالیف میں شبلی کی تحریروں میں سے جو جواہر ریزے جمع کئے ہیں ان کے مطالعے کے بعد شبلی کی شخصیت کا یہ پہلو بھی سامنے آجاتا ہے اور ان کی زندگی کچھ اور درخشندہ اور پرکشش نظر آنے لگتی ہے۔

ایس۔ جالب۔ مظاہری
اسماعیل بیگ محمد ہائی سکول
محمد علی روڈ بمبئی ۳۔

شبلی کی ذہانت وطبّاعی

"پانی کیسے برسے گا"

مولانا شبلی کا بچپن بہت نازونعم میں گزرا۔ وہ فطرۃً ذہین تھے اور حافظہ بھی توی تھا اسی عمر کا ایک واقعہ ہے کہ چاندنی رات تھی صحن میں لیٹے تھے اور لوگ اُٹھاکر اُن کو سائبان میں لےجانا چاہتے تھے اور یہ جاتے نہیں تھے۔ کسی نے کہا اُٹھو اُٹھو پانی برسے گا۔ فوراً جواب دیا "واہ چاند تو نکلا ہے، پانی کیسے برسے گا۔" لوگ اس پر ہنس پڑے۔

شبلی ہندی پر شبلی بغدادی کا گمان

مولانا کے والدین نے اُن کا نام شبلی اپنے صوفیانہ ذوق سے رکھا تھا شبلی مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ بغدادی المتوفّی ۳۳۴ھ کا مشہور نام ہی مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی فرماتے ہیں۔ "میرے بڑے پھوپھا۔۔۔

عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور سرسیدؒ کے مخلصوں میں تھے۔ اُن کی یادگاریں اب بھی یونی ورسٹی میں قائم ہیں۔ علامہ شبلی کے علی گڑھ کے تقرر کے ابتدائی دور میں جب موصوف نے شبلی نام سنا تو کہا:۔

"کیا آپ بغداد سے آئے ہیں؟"

جمعرات کا انتظار!

بچپن میں ہر جمعرات کو مولانا کا ایک پیسہ مقرر تھا۔ مولانا کو ہر جمعرات کو اس کا انتظار رہتا تھا۔ مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کا ایک پرانا ملازم اُن کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہی پیسہ دیا کرتا تھا۔ مولانا اگر کبھی پہلے پیسہ مانگ لیتے اور ضد کرتے تو وہ پیسے کو آگ پر رکھ دیتا اور کہتا "۔ ابھی پیسہ بن رہا ہے۔" آخر وہ بن کر جمعرات ہی کو ملتا۔

اَنَا اَسَدٌ وَّاَنْتَ شِبْلٌ

مولانا شبلی، مولانا محمدؐ فاروق صاحب چریا کوٹی کے شاگردِ رشید تھے شبلی جیسا طبّاع تلمیذ اور مولانا محمدؐ فاروق سا متبحر اُستاد، فیضِ تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ چند ہی دنوں میں یہ جوہرِ قابل ایسا چمکا کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ اور ہونہار شاگرد، اُستاد کے لئے مایۂ ناز بن گیا چنانچہ مولانا فاروق صاحب اسی زمانے میں اکثر فخریہ فرمایا کرتے تھے:۔

"اَنَا اَسَدٌ وَّاَنْتَ شِبْلٌ" (میں شیر ہوں اور تو بچہ شیر)

"شبل" عربی میں شیر کے بچے" کو کہتے ہیں۔
انا اسدٌ انتَ شبلی۔ میں شیر ہوں اور تو بچۂ شیر۔

حسنِ طلب

ایک مرتبہ مولانا کو بچپن میں اوڑھنے کی ضرورت پڑی۔ مولانا کے والد شہر کے رئیس تھے۔ شبلی کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک رئیس کے بیٹے کو چادر نہ ملے۔ اُنھوں نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر پیش کیا ؎

پدر جس کا یوں صاحبِ تاج ہو۔
پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

باپ بہت خوش ہوئے اور بیٹے کو چادر انعام دی۔

"یہ حضرت بھی بس ہو چکے!"

مولانا کو اُن کے منجھلے بھائی مسٹر مہدی حسن مرحوم بی اے بیرسٹر ایٹ لا کے امتحان میں فیل ہونے کی خبر ملی ہے اس سلسلے میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

مہدی کے فیل ہونے کا رنج کس کو نہیں ہے۔ مگر اتنا فرق ہے کہ مجھے یہ رنج بہت پہلے ہو چکا تھا۔ کیوں کہ قبل سے ان کا فیل ہونا مجھ کو معلوم ہو چکا تھا۔ یہ حضرت بھی بس ہو چکے۔

جمالیاتی ذوق، شاعری، موسیقی سے لگاؤ، نفاست پسندی، نازک مزاجی اور پابندیٔ اوقات

قیمتی عمامہ اور چھ ٹکے کا صافہ

مولانا عام طور سے سر پر عمامہ نہیں باندھتے تھے۔ مگر قومی جلسوں اور تقریروں کے موقع پر وہ زرد ریشمی کام کا عمامہ اور عمدہ مدنی عبا زیب تن کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ندوے میں کوئی تقریب تھی۔ مولانا ریشمی کام کا عمامہ باندھ کر آئے تھے۔ اتفاق سے علامہ سید سلیمان مرحوم بھی سوتی ململ کا صافہ باندھ کر آئے تھے تو ان سے فرمانے لگے:۔

دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے، مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہے اور تمھارا چھ ٹکے کا صافہ ہے۔ مگر اس قرینے سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے۔

"شیرینی کیلئے صرف میٹھا ہونا کافی ہے"

مولانا کو شیرینی بہت مرغوب تھی اور اس کے لئے کسی خاص

قسم کی ضرورت نہ تھی، جو بھی ہو اور جیسی بھی ہو فرماتے تھے:۔
شیرینی کے لئے صرف میٹھا ہونا کافی ہے۔

شکر میں بھی مٹھاس نہیں!

ایک مرتبہ نواب حسن علی خاں کے عزیز خواجہ رشید الدین صاحب عرف اچھے صاحب نے مولانا کے لئے چوگنے شکر کے میٹھے چاول پکوائے، کھاتے وقت مولانا سے پوچھا کہ "مولانا میٹھا تو ٹھیک ہے؟ چوگنی شکر چھوڑی ہے۔" مسکرا کر فرمایا۔
یہ کون کہتا ہے کہ شکر میں مٹھاس ہے۔؟

مٹھائی اچھی ہو یا ناقص پھر بھی مٹھائی ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فرماتے ہیں ایک بار ندوے کے اجلاس سے واپسی میں بریلی سے علی گڑھ مولانا کی ہم راہی ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر مٹھائی خریدی، چکھی خواہ اچھی تھی یا ناقص میں نے استعجاب ظاہر کیا تو فرمایا:۔ "مٹھائی ہے"۔

ایک شیرینی پرست اور میٹھے چاول

مولانا کو شیرینی کے متعلق لطیفے خوب یاد تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ ایک دوست نے دوسرے شیرینی پرست دوست کو مدعو کیا

تو اُنھوں نے کہا یار کیا کھلاؤ گے ؟ کہا بہت اعلا میٹھے چاول، گھر آکر باورچی طلب ہوا بہ اصرار شیرینی کی مقدار بڑھوائی گئی اور چوگنا میٹھا پڑا فخر سے کھلایا۔ ختم طعام پہ داد چاہی تو جواب ملا "جتنے چاول تھے اُسی قدر پھیکا پن تھا۔"

رساول بالائی سے پھیکی ہوجاتی ہے

مولانا رساول بہت شوق سے کھاتے تھے اور اس اہتمام سے پکواتے تھے کہ مصنوعی طریقوں سے اس کو صاف کروانا بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ اس سے اس کی طبعی مٹھاس کم ہوجاتی ہے۔ اسی لئے رساول میں بالائی یا دودھ نہیں ملاتے تھے۔ ایک دفعہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے ان کے پاس رساول بھیجی اور اودھ کے مذاق کے مطابق اس میں بالائی ملادی۔ ملاقات ہوئی تو فرمایا:۔
"تم نے رساول کو غارت کر دیا۔ بالائی سے تو پھیکی ہوجاتی ہے۔"

شکر سے پرہیز ہو تو پھر جی کر کیا کروں گا

مولانا کو مٹھاس اتنی مرغوب تھی کہ مصری کے ڈلے چبایا کرتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے انگریزی شکر کے ایک ایک دانے منھ میں ڈالا کرتے تھے۔ اور بیکاری کے اوقات میں یہ ان کا لذیذ ترین مشغلہ تھا، پیشاب میں شکر آتی تھی۔ طبیب، ڈاکٹر اور احباب اس طرح شکر کھانے

سے روکتے تھے، مگر وہ نہیں مانتے تھے۔ ایک دفعہ نواب سید علی خاں صاحب اور اچھے صاحب فرماتے تھے۔ کہ مولانا بیمار تھے کہ ہم لوگ دیکھنے کے لئے گئے۔ سر سے پیر تک لحاف اوڑھے تھے۔ منہ بھی بند تھا، مگر دانتوں کے چلنے کی آواز آتی تھی۔ پوچھا آپ کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا "کچھ نہیں" لحاف اُٹھا تو دیکھا کہ سینے پر شکر کی ایک طشتری رکھی ہے اور وہ ذرا ذرا اس کو کھا رہے ہیں۔ ہم نے عرض کی اس حالت میں شکر سے پرہیز فرمائیے۔ فرمایا "تو پھر جی کر کیا کروں گا۔"

"چائے میں دودھ کی آمیزش انگریزوں کی بدعت ہے"

چائے دن رات میں کئی دفعہ پیتے تھے لیکن صبح کو جب سویرے اُٹھتے تھے، تو اس وقت ملازم کو تکلیف نہیں دیتے تھے، بلکہ خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا لیتے تھے۔ چائے کی پیالیاں چھوٹی ہوتی تھیں۔ عموماً سادی چائے پیتے تھے۔ فرماتے تھے "چائے میں دودھ کی آمیزش انگریزوں کی بدعت ہے۔"

برف کی قفلیاں

مولانا برف کی قفلیاں بھی کھاتے تھے، لیکن اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ ایک بار برف کی قفلیاں بکنے کو آئیں، تو خریدنا چاہیں کسی نے کہا اچھی نہیں ہیں۔ فرمایا:۔

"منہ تو بہرحال ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"مولوی پہلے لکھتے ہیں، پھر مٹاتے ہیں"

مولانا باوجود سادگی کے نہایت صفائی پسند تھے۔ گرمیوں میں آم کھاتے تو ملازم سامنے ایک طشت رکھ دیتا اسی میں چھلکے اور گٹھلی رکھتے جاتے زمین پر نہ پھینکتے۔ ایک بار دارالعلوم میں ایک بڑے مدرس کے سامنے زمین پر آم کے چھلکے دیکھے تو فرمایا "آپ چھلکے کسی برتن میں کیوں نہیں رکھتے؟" اُنھوں نے کہا "بھنگی آئے گا تو اُٹھا لے جائے گا" بولے "مولوی پہلے لکھتے ہیں پھر مٹاتے ہیں۔"

خوابِ خلوت

مولانا سے ہمیشہ لوگ ملنے آتے تھے۔ وہ خود جلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ یار باش اور احباب پسند تھے، مگر کام کے اوقات اور سونے کے وقت میں ان کو خلوت پسند تھی۔ رات کو ہمیشہ کمرے میں تنہا سوتے تھے اور کتنا ہی بڑا مکان ہوتا لیکن اس میں کسی دوسرے کو سونے نہیں دیتے تھے۔ فرماتے تھے:۔ "دوسرے شخص کے تخیل سے بھی مجھے نیند نہیں آسکتی۔"

طبع بوقلموں کی نیرنگیاں

بعض اوقات بعض لوگ ان سے ملنے آتے اور دیر تک بیٹھے رہتے، تو ان کو سخت تکلیف ہوتی۔ فرماتے: "میں نے عجب متضاد طبیعت

پائی ہے۔ احباب کی صحبت لازمی ہے، لیکن چند مخصوص گھنٹوں میں بلکل تنہائی چاہیے۔"

میں آدمی تو ہوں، مگر انا النّاس (اناناس) کو پسند نہیں کرتا

پھلوں میں مولانا کو نارنگیاں پسند تھیں اور اناناس مرغوب طبع نہ تھا۔ اپنے ایک عزیز شاگرد سے نارنگیوں کا حسنِ طلب اور اناناس سے ناپسندیدگی کا اظہار کس مزے سے کرتے ہیں:۔

"ہاں مجھ کو نارنگیاں بہت پسند ہیں، لیکن تمھاری تکلیف کے لحاظ سے کبھی تکلیف نہیں دی۔ میں آدمی تو ہوں، مگر انا النّاس (اناناس کو ظرافتہً انا النّاس لکھا ہے) کو پسند نہیں کرتا"

ع اَنَا النَّاس ۔میں آدمی ہوں۔

بمبئی کے ایک ہوٹل پر کوہِ قاف کا اطلاق

مولانا ایک مرتبہ بمبئی میں ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ یہیں سے ایک خط مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب کو لکھا ہے۔ جس میں لکھتے ہیں:۔

اپالو کی اب ضرورت نہیں، میں جس ہوٹل میں آ گیا ہوں، خود کوہِ قاف ہے۔ آپ بھی آتے تو بڑا لطف ہوتا۔"

صنم زارِ بمبئی کی دِل چسپیاں

ایک خط میں عروس البلاد بمبئی کی نشاط انگیز زندگی کا نقشہ مختصر لیکن کس قدر موثر الفاظ میں کھینچا ہے :۔

"یہاں کی دِل چسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا"

وَاَنَا اَوَّلُ الْعَابِدِیْنَ

مولانا کا جس وقت بمبئی کے ممتاز خاندان فیضی سے تعارف ہوا، اس وقت عطیہ بیگم اپنی تعلیم کے لحاظ سے بہت کچھ شہرت رکھتی تھیں۔ انھوں نے آزاد تعلیم پائی تھی اور پہلی مسلمان خاتون تھیں، جو یورپ کی تعلیم کے لیے گئی تھیں۔ بمبئی کے تعلیم یافتہ مسلمان خاندان کی طرح آزادانہ معاشرت تھی۔ عطیہ بیگم کی دوسری بہنیں زہرا بیگم اور نازلی رفیعہ بیگم نے اگرچہ عطیہ بیگم کی طرح باقاعدہ تعلیم نہیں پائی، بایں ہمہ نہایت قابل ہیں۔ عطیہ بیگم سب سے چھوٹی ہیں، لیکن سب سے زیادہ تیز اور ذہین ہیں۔ مولانا نے ان میں وہ سب جوہر دیکھے، جن سے ایک خاتون قابلِ رشک مرتبہ حاصل کر سکتی ہے۔ ان کے دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ ان جوہروں کو جلا دیں اور عطیہ بیگم کو ایک نمونہ بنا دیں چنانچہ ایک خط میں ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو، تو تم جانتت

دو کہ لوگ تم کو پوجیں۔ وَ اَنَا اَوَّلُ العَابِدِیْنَ"۔

ع۱ وَ اَنَا اَوَّلُ العَابِدِیْنَ۔ اور میں جو پوجنے والے ہیں ان میں سب سے اوّل ہوں۔

پبلک لائف رخشِ ہمت کے لئے عناں گیر ہے

مولانا بے پردگی کو کچھ ایسا معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ البتہ کبھی اس کا اعلان نہیں کیا، اور نہ کبھی اس پر عمل کرنے کی جرارت کی۔ عطیہ بیگم نے ایک بار اسی بات پر انھیں کم ہمتی کا الزام دیا ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"تم کہتی ہو کہ میں بہت "بدہمت" ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھوں میں نہ ہوتا، تو تم میری ہمت کا اندازہ کرسکتیں"!

خط کیوں پہنچتا!

مولانا نے نواب بیگم والدہ عطیہ بیگم کو کچھ کتابیں بھیجی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عطیہ بیگم کے نام خط بھی ہے۔ کتابوں کی رسید آئی، مگر خط کا جواب نہیں آیا۔ اس سلسلے میں ذرا ادائے نگارش کو ملاحظہ فرمائیے:۔

"وہ کتابیں میں نے مخصوص نواب بیگم صاحبہ کے لئے بھیجی تھیں، خط

بھی تھا، لیکن وہ کیوں پہنچا ہوگا۔"

کعبۂ و حجاز والی دُعا کا کھٹکا!

زہرہ بیگم کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"عطیہؔ کو میں نے خدا حافظ نظم میں لکھا تھا۔ آپ نے دیکھا نہیں؟ نہ دیکھا ہو تو چند شعر لکھ بھیجوں۔ اس شعر پر" بہ سلامت روی و باز آئی" مصرعے لگائے تھے۔

ایک شعر یہ تھا ؎

میروی سوئے پیرس و لندن۔ وزرہِ کعبۂ و حجاز آئی

اشعار میں جو دعائیں مانگی تھیں، ان میں سے ایک اسی کے قبول نہ ہونے کا کھٹکا ہے۔"

"میں وہی شبلیؔ نعمانی ہوں"

ایک خط کے آخر میں عطیہؔ بیگم کو بڑے شوق اور پیار سے لکھتے ہیں۔ اس سے ان کے اختلاط اور ارتباط کی حد کہاں تک پہنچ گئی ہے، اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

ع میں وہی شبلیؔ نعمانی ہوں!

⁂ ⁂ ⁂

زبانی مبارکباد دینے کی حسرت!

عطیہ بیگم کو ولایت کے سفر سے واپسی پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفاشعار دل کی طرف سے مراجعت کی مبارکباد قبول کرو۔ میری زندگی کا یہ سخت افسوسناک واقعہ ہے کہ یہ مبارکباد میرے لب کے بجائے، زبانِ قلم ادا کرتی ہے!"

"حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن ست وبس"

ایک خط میں عطیہ بیگم کو محبت بھرے مایوسانہ الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

"میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالا کر دیا، اس لئے یہ توقع رکھنا کہ اب آپ اسی طرح سے ملیں جیسا کہ وعدہ کیا تھا، صحیح نہیں۔ خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خود دارانہ ہے۔ بہرحال
ع حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است وبس"

آپ کی بجائے تم

ایک خط میں اپنے خصوصی تعلّق کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

"معاف کیجیے! میں "آپ" کے بجائے "تم" کا لفظ لکھوں گا "آپ" کے لفظ میں بے گانہ پن ہے۔"

ناقابل استاد اور قابل شاگرد!

ایک جگہ عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں :۔

"ولایت سے آجاؤ اور موقع ہو تو تم کو فارسی کا پورا استاد بنا دوں۔ گو خود شاگردی کے بھی قابل نہیں"

"جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں"

عطیہ بیگم کا عورتوں کے متعلق خیال تھا کہ دینوی اور معاشی علم کو پڑھیں اور وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھیں کہ عورتیں خود دکھائیں اور دکھائیں۔ اس سلسلے میں عورتوں کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں :۔

"تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو، لیکن یہ تو میرا نا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور زردی کا گالا ہونا چاہیئے جمال اور حسن، نزاکت پر موقوف نہیں، تنومندی، دلیری، دیوپیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے، مردنما عورت، زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے"

عطیہ کے بے محل محاورے کے استعمال پر شبلی کی گرفت!

عطیہ بیگم کے خطوں میں زبان اور محاوروں کی جو غلطیاں ہوتی تھیں، ان پر مولانا ہمیشہ ٹوکتے رہتے تھے، اور اس کی اصلاح کر دیتے

تھے۔ ایک خط میں عطیہ بیگم نے کسی موقعے پر لکھا ہے "میں ہضم نہیں کر سکتی"، اس محاورے کے بے محل استعمال پر ان کی گرفت کی ہے اور کس مزے سے سمجھاتے ہیں:۔

"ہاں تم نے ایک خط میں لکھا ہے کہ "میں ہضم نہیں کر سکتی"۔ کیا یہی لفظ ہے، اور کیا اس کے معنی تم نے تسلیم کر لئے ہیں۔؟ اگر ایسا ہے تو سخت غلطی کی ہے! یہاں کے لوگوں کو اس پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔"

المجاز قنطرۃ الحقیقت[1]

ایک خط میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو، جو ان کے محرمِ راز دوست تھے، لکھتے ہیں:۔

"مدراس ضرور تشریف لائیے۔ مجاز قنطرۃ الحقیقت ہے"

[1] المجاز قنطرۃ الحقیقت۔ عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی کا پل ہے۔

خواجہ حافظ کے ایک مصرعے میں تصرّف

ایک خط میں بمبئی سے ایم مہدی حسن کو لکھتے ہیں:۔

"۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتّفاق ہوا۔ یہاں کی دل چسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا۔ اپا لو یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعے کو یوں بدل دیا ہے:۔ ع کنارِ آب چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را"

"میں ہارا تم جیتیں!"

عورتوں کی تعلیم کے متعلّق مولانا اور عطیّہ بیگم میں جو تحریری مباحثے کا سلسلہ چھڑا تھا، شبلی نے اپنی رائے کی تائید میں بڑی محکم دلیلیں پیش کیں؛ لیکن ان کا مقابلہ مردانہ رنگ کی ایک مستقل مزاج عورت سے تھا۔ بالآخر انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور اس میں بھی انھوں نے جذباتی لذّت محسوس کی۔ اس سلسلے میں عطیّہ کو لکھتے ہیں:۔

" مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں، لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیّہ! میں تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں۔"

الٰہ آباد جانے کیلئے بمبئی کی رنگینیوں کی شرط

۱۹۰۹ء میں جب مولانا شبلی اور عطیّہ بیگم کے درمیان بعض واقعات ایسے رونما ہوئے جن سے باوجود کوشش بسیار کے ٹوٹے ہوئے دل نہ جڑ سکے، تو مولانا نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ چنانچہ ایم مہدی حسن کو اس خط میں جس میں بمبئی کے آب حیواں سے اپنی محرومی کی شکایت کی ہے، لکھتے ہیں:۔

" الٰہ آباد بلایئے، تو آجاؤں، لیکن شرط یہ ہے کہ بمبئی کا نعم البدل نہ ہی برابر سرابر تو ہو۔ کیا امّید ہو سکتی ہے؟"

❖ ❖ ❖

"میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا"

نومبر ۱۹۱۲ء میں عطیہ بیگم کی شادی ایک یہودی آرٹسٹ مسٹر سیموئیل رحیمن سے ہوگئی اس کی نسبت مہدی حسن کو لکھتے ہیں:۔

"قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل وخوار بنا دیئے گئے، لیکن کیا ۵ر دسمبر ۱۹۱۲ء کے بعد بھی، جس دن عطیہ ایک یہودی کو ہاتھ آئی مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے۔ اس لئے تو نہیں کہ

ع میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا"۔

پہلا اتّفاق

مولانا رات کو ۹ بجے سوجاتے۔ سونے کے لئے یہ اہتمام تھا کہ اپنے پاس اتنی دور تک کہ سونے والے کے خرّاٹے کی آواز سنائی دے کسی کو سونے نہیں دیتے تھے۔ مولانا شروانی فرماتے ہیں کہ کلکتے میں ایک موقعے پر میراان کا شب کو ایک کمرے میں سونا ہوا تو فرمایا:۔

"آج عمر میں یہ پہلا اتّفاق ہے، بالآخر دوسرا کمرہ تجویز ہوا۔"

دماغ گرم اور جسم سرد!

مولانا گرمیوں میں بھی توشک بچھاتے تھے اور رضائی پائتانے رکھی جاتی تھی۔ مولانا شروانی فرماتے ہیں۔ جب رگنج کے قیام میں پہلی

شب کو ساری رضائیاں اُڑھائی گئیں۔ سردی کی شکایت رہی دوسرے دِن ڈھائی سیر روئی کا لحاف تیار کیا گیا۔ جب چین آیا۔ جب گنج سے بھیکم پور نواب مزمل خان مرحوم کے یہاں گئے تو شب کو وہی لحاف طلب ہوا۔ اسی کے ساتھ کوئی پانی ان کے واسطے ٹھنڈا نہ تھا۔ صراحی کا باسی پانی بھی پاس نہ ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ اجتماع الضدین کیا ہے ؟۔

فرمایا "میرا دماغ گرم ہے، جسم سرد"

لباس کا اثر

مولانا کپڑے بھی نہایت سادہ پہنتے تھے۔ کپڑوں کی تعداد بھی نہایت محدود تھی۔ سات آٹھ سفید پائجامے، اسی قدر کرتے اور تین چار سرد اور گرم شیروانیاں۔ عمامہ اور عبا کا استعمال صرف مخصوص جلسوں میں کرتے تھے۔ ایک بار تو شیروانی وغیرہ سب بالائے طاق رکھ دی تھی اور صرف ایک کرتہ، ایک صدری اور میرٹھ کی ٹوپی استعمال کرنی شروع کی تھی۔ ندوے کے جس جلسۂ انتظامیہ میں مولانا یہ کمیشن بیٹھا تھا۔ اس میں مولانا اسی وضع میں گئے تھے۔ فرماتے تھے :-

"اس لباس نے مجھ میں کچھ انکسار پیدا کر دیا تھا کہ میں خاموش تمام لوگوں کا منھ دیکھتا رہا۔ شیروانی پہننے سے بدن میں جو چستی پیدا ہوتی تھی

اس کا مطلق اثر نہیں معلوم ہوتا تھا،
ورنہ ایک ڈانٹ میں تمام کمیشن ہوا ہو جاتا۔"

ایک بڑے مخالف کی نظر میں شبلی کی ایک بڑی خوبی!

مولانا اپنے معمولات اور فرائض کے سخت پابند تھے۔ قاضی تلمذ حسین صاحب جو ایک زمانے میں مولانا کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ فرماتے تھے کہ:-

" تمام عیوب کے ساتھ مولانا شبلی میں بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خط کا جواب ٹھیک وقت پر دیتے ہیں"

یورپ میں قیام کی آرزو

الندوہ کی اشاعت میں اکثر دیر ہو جاتی تھی۔ اس سے سخت پریشان ہوتے تھے اور اس کے لئے صاحب مطبع اور مضمون نگاروں پر سخت پابندیاں عائد کرتے تھے جب اُن سے بھی کام نہیں نکلتا تھا تو فرماتے تھے:-

اب تو یورپ میں رہنے کو جی چاہتا ہے، جہاں کام ٹھیک وقت پر انجام پاتا ہے۔"

ایمان بالغیب پر ایمان بالحضور کو ترجیح

ایک خط میں مولانا شروانی سے بمبئی کی رنگین صحبتوں کو کس خوبی سے

اشاروں اشاروں میں بیان کیا ہے :-

"بہشت سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں! افسوس آپ ایمان بالغیب کو ایمان بالحضور پر ترجیح دیتے ہیں :"

"میں جہاں گیری ہوں!"

النّدوہ میں مولانا کا ایک مضمون جہاں گیر پر شائع ہونے والا ہے اس سلسلے میں ایک جگہ مولانا شروانی سے کس خوبی کے ساتھ اپنے عاشقانہ و رندانہ مزاج کی ترجمانی کی ہے :-

لوگ اکبری یا عالمگیری ہیں، لیکن میں جہاں گیری ہوں اب کی "النّدوہ" کے آئینے میں جہاں گیر کی صورت دیکھئے گا۔"

لکھنؤ کے موسم گرما کی شکایت

ایک جگہ لکھنؤ کے موسم گرما کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہاں اس قدر گرمی ہے کہ بولا گیا ہوں۔"

مولانا شروانی کو مُطّلا حمائل کی خریداری کی اطّلاع اور حسن طلب سے حسین اعراض

مولانا نے ایک نہایت خوبصورت، قلمی، مُطّلا حمائل بمبئی میں خریدی تھی۔ اس کی اطّلاع مولانا شروانی کو دیتے ہوئے کس خوبی سے ان کے

حسنِ طلب سے پہلو بچاتے ہیں:۔

"آج وہ حمائل لے لی۔ دو سو پچاس نذرانے کے دیئے۔ کل ۲۴ برس کا ہے تاہم ایک چیز ہے۔ ایران کا خاتم الخطاطین احمد تبریزی تھا۔ آغاخان اوّل کے بھائی نے اس کو ایران سے بلا کر لکھوایا تھا۔ اوّل سے آخر تک مُطلّا ہے۔ یعنی سطر یہ طلائی ٹکڑے ہیں۔ اور تقطیع نہایت موزوں ہے۔ کہیں تسعٌ وتسعون نعجۃً[۱] کا دعویٰ نہ پیش کیجیے گا۔"

[۱] تسع وتسعون نعجۃ۔ ننانوے دنبیاں۔ حضرت داؤد علیہ السّلام کے ننانوے بیبیاں تھیں۔ ایک عیسائی کی عورت کو جس کے صرف ایک ہی بیوی تھی اپنی بیبیوں میں شامل کرنا چاہا اور اس کے شوہر اوریا سے اس کی درخواست کی۔ اس زمانے کی رسم کے موافق اس شخص کو نبی کی درخواست رد کرتے ہوئے شرم آئی۔ اوریا نے اپنا تعلق قطع کر لیا اس عورت نے حضرت داؤد ع سے نکاح کر لیا۔ نبی کو یہ نامناسب تھا اس پر خدا تعالیٰ کی جانب سے عتاب نازل ہوا۔ داؤد نے ایک دن مقدمات فیصل کرنے کا اور ایک دن بیبیوں کے پاس رہنے کا اور ایک دن خاص خلوت میں عبادت کرنے کا مقرر کر رکھا تھا۔ عبادت کے دن دربان کسی کو اندر آنے نہ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے دو فرشتے جبرئیل اور میکائیل دیوار کے اوپر سے داؤد ع کے سامنے آکھڑے ہوئے اور اشارۃً اپنے اوپر چسپاں کر کے خود داؤد ہی کا قصّہ بیان کیا اور کہا کہ ہم دونوں باہم جھگڑنے والے ہیں۔ ہم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے۔ یہ میرا بھائی

ہے اس کے پاس ننانوے بیبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے۔ اب یہ کہتا ہے کہ وہ دنبی بھی مجھے دے ڈال اور اس کے سے مجھ پر سختی کرتا ہے۔ داؤدؑ نے کہا یہ بے شک تجھ پر ظلم کرتا ہے کہ تیری دنبی بھی اپنی دنبیوں میں ملانے کو مانگتا ہے۔ اس وقت داؤدؑ کو خیال آیا کہ خدائے تعالیٰ نے ان کو آزمایا ہے۔ انھوں نے خدا سے معافی چاہی اور سجدے میں گر پڑے۔ خدائے تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف کردی۔

دوست کی زیارت پر مصحفِ پاک کی زیارت کا انحصار

اسی حمائل کے متعلق مولانا کو لکھتے ہیں:۔
"انشاءاللہ آپ کی زیارت ہوگی تو مصحفِ پاک کی زیارت کراؤں گا"

مردنُما عورت

بمبئی میں ایک ہندو عورتوں کی کانفرنس تھی مولانا بھی اس میں شریک تھے۔ اس کے متعلق مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔
"زنانہ جلسہ بہت کامیابی کے ساتھ ہوا، گجراتی اور مرہٹی میں عورتیں خوب بولیں۔ بعض عورتیں تو مردنُما معلوم ہوتی تھیں۔"

ضعفِ بصارت کا اقتضا

مسٹر عبدالماجد بی۔اے نے بہ تعلقِ سیرت نبی انگریزی ترجمے

کہ پہلی قسط بھیجی تھی۔ حروف نہایت باریک اور خفی لکھے تھے، جس کی وجہ سے مولانا صاف نہیں پڑھ سکتے تھے اس سلسلے میں ان کو لکھتے ہیں:۔

"ترجمہ پہنچا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ خوش خط لکھتے ہیں، لیکن میری ضعفِ بصارت مستدعی ہے کہ ذرا جلی لکھیے"

کافورِ پیری میں جوانی کی آگ!

بمبئی کی حسین و رنگین صحبتیں ایک پیرِ پنجاہ سالہ کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ کچھ جذباتِ قلبی شعر بن کر نوکِ قلم سے ٹپک پڑے ہیں، جو اس بڑھاپے میں زیب نہیں دیتے۔ اس احساس کے ساتھ ایم مہدی حسن کو رقم طراز ہیں:۔

"بمبئی میں بڑی دل چسپیاں ہیں، جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں۔ جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں۔ حافظ تو کہتے ہیں ع ہر گہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم، اور ایک بار پرانا تجربہ کار کہتا ہے ع عشق در ہنگام پیری چوں بہ سر ما آتش است، کیا یہ فلسفہ صحیح ہے۔؟ ابھی نہیں، ۱۵ برس کے بعد (یعنی جب آپ بھی پیر ہو جائیں) جواب دیجیئے گا"

بمبئی یورپ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے

ایک اور جگہ اسی سلسلے میں ایم مہدی حسن کو لکھا ہے:۔

"یورپ باین تہذیب سال بھر میں ایک دن پاگل ہو جاتا ہے۔ بمبئی کے دن، اسی دن کے سلسلے میں ہیں۔"

ہندوستان و ایران کا مذاقِ حُسن

"موازنہ انیس و دبیر" کی تقطیع بڑی ہونے کی کیا حسین تاویل کی ہے:۔
"موازنہ میں اشعار کا اقتباس اتنا آگیا کہ تقطیع بڑی نہ ہوتی، تو کتاب ضخیم ہو کر بھدّی ہو جاتی۔ بوٹا قد، ہندوستان کا مذاق ہے، ایران میں تو کشیدہ قامتی مرغوب ہے۔"

عطیہ بیگم کو شادی کا شعری تحفہ

بمبئی کی مشہور خاتون عطیہ بیگم کی شادی ایک نومسلم یہودی نقّاش و مصوّر سے ہوئی اس پر مولانا نے نئے نئے مضامین پیدا کر کے عطیہ بیگم کو تحفہ بھیجا تھا۔ مندرجۂ ذیل قطعہ (بہ زبان عطیہ بیگم) اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھکو کوئی اپنی طرف ؛ اسلیئے تنگِ قرابت سے مجھے دوری تھی
آپ نقّاش ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں ؛ آپ نے مجھکو جو کھینچا تو یہ مجبوری تھی

شرابِ معرفت پر طنز

خیّام اور حافظ دونوں کا خاص موضوع شراب ہے، مگر خیّام بیچارہ تو یورپ پہنچ کر غیر ثقہ ہو گیا۔ لیکن حافظ کی بات ایشیا میں اس قدر بنی

کہ چھوٹے پیمانے کے پیغمبر سمجھے جانے لگے۔ ایک جگہ خیّام کی مُصطلح مے نوشی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا اور صوفی نہ تھا ورنہ حافظ کی طرح بھی شراب، شرابِ معرفت بن جاتی۔"

رشتے کی کھٹک!

نوّاب صاحب جنجیرہ اور ان کا پورا خانداں مولانا کا شیدائی تھا۔ عطیّہ بیگم ان کی انشاپردازی اور قلمی شہرت کی قدرداں تھیں، لیکن ان دونوں کی عمروں میں جو فرق تھا۔ وہ کسی دوامی تعلّق یا پائدار دوستی کے قابل نہیں تھا۔ شبلی اس فرقِ عمری کو کم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ جب زہرا بیگم (عطیّہ بیگم کی بہن) نے ایک بار شبلی کی صاحبزادیوں کو بہن کہہ کر مخاطب کیا، تو شبلی کو یہ رشتہ کھٹکا اور فوراً اُن کو اس سے روکنے کے لئے قلم اٹھایا۔ اور الٹیں، بناتِ غم بنانے کی کوشش کی:۔

"ہاں آپ نے پہلے خط میں صغرا اور فاطمہ کو بہن لکھا ہے۔ عزیزانہ تعلّق تو قطعی ہے" لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسن صاحب مرحوم (زہرا اور عطیّہ کے والد) عمر اور ہر حیثیت سے میرے چچا تھے اسی لحاظ سے رشتہ قائم ہونا چاہئے۔ میری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے (اور عطیّہ بیگم اس وقت صرف بیس برس کی تھیں) اس لئے اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں۔"

حق گوئی، بے باکی، فیاضی، خودداری، کسرِ نفسی اور فرض شناسی

"خود اپنا آلہا کیا گاؤں"

۱۹۱۲ء میں سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری نے کچھ حالات مولانا شبلی سے سوانحِ حیات کے قلم بند کرنے کے خیال سے دریافت کئے تو ایک ایک دو دو سطروں میں کچھ اپنی تعلیم، کچھ قیام علیگڈھ اور کچھ اپنی تالیفات و آراء کا حال لکھ کر دو صفحوں میں خط کو تمام کر دیا اور آخر میں یہ لکھ دیا کہ

"خود اپنا آلہا کیا گاؤں"

ایک مُسکت جواب

ایک روز سر سید نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تاکیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے؟ مولانا نے

فرمایا۔

"اس لئے کہ وہ آپ کو پڑھتے ہوئے نہیں دیکھتے"

"پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہی صدمہ"!

کان پور کے محلّہ مچھلی بازار میں ایک مسجد برسرِ راہ تھی۔ وہاں سے شہر کی میونسپلٹی نے ایک نئی سڑک نکالی۔ جس میں مسجد کا ایک حصّہ جو وضوخانہ تھا بیچ میں آگیا۔ اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کردیا گیا حالانکہ اسی کے پاس ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا، جس کو بچا کر یہ سڑک نکالی گئی۔ اس واقعے نے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگا دی۔ مسلمانانِ کان پور نے مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی مدرّسِ اعلیٰ الٰہیات کانپور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشّان جلسہ منعقد کیا۔ جلسے میں کافی جوش وخروش پیدا ہوا۔ جلسے کے بعد پُرجوش مسلمانوں نے جن میں بچّے بھی تھے، مسجد کا رخ کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چن چن کر رکھنے لگے۔ مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے یہ دیکھ کر مسجد پر متعیّن سکھ فوج کو ان نہتّے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے ان پر نہایت بے رحمی سے دُور سے گولیاں برسائیں اور قریب سے برچھے مارے۔ شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے بچّے بھی شامل تھے۔ متعدد گرفتاریاں بھی ہوئیں اس خونی سانحے نے تمام ہندوستان کو خونی بنا دیا اور مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ مولانا اس واقعے کے سلسلے میں ایک قطعے میں مسلمان قیدیوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ہم قائم آپکا ہونا تو بہت ہے دشوار — اُن کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ — یعنی افسوس ہیں زنجیر کے قابل ہی نہیں

لوگوں کی ضعیف الاعتقادی!

مولانا نے پٹنہ کا متعدد بار سفر کیا۔ ایک دفعہ ۴ر فروری ۱۹۱۲ء کی صبح کو جب وہ پٹنہ پہنچے تو اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لئے معتقدین کا نہایت کثرت سے مجمع تھا۔ شہر کے عمائد اور کالج کے تمام طلبہ موجود تھے۔ طلبہ کے اصرار سے گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے گئے۔ اور طلبہ ذوق شوق کے عالم میں گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر فرودگاہ تک لائے۔ مولانا اس واقعے کو لکھ کر یہ فرماتے ہیں۔

"یہ تو نہیں کہتا کہ رعونت پرست نفس کو پھریری نہیں ہوئی ہوگی۔ لیکن واقعاً ہنسی آتی ہے کہ عجب خوش اعتقاد، بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں"۔

اسلام کے مجسمہ غیرت کے پاؤں!

مولانا محمد علی مرحوم کی کوشش سے ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد ٹرکی کے محاذ جنگ پر بھیجا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت بلکل جوان تھے۔ اور مولانا بوڑھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب لکھنؤ ہوکر روانگی کے لئے دلّی جا رہے ہیں۔ لکھنؤ کے اور چند ممتاز لوگ بھی الوداع کہنے کو موجود ہیں۔ گاڑی روانہ ہونے کو ہے۔ مولانا پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ڈبّے کے دروازے پر کھڑے وداعی سلام کر رہے ہیں کہ دفعۃً ہمہ تن جوش علامۂ وقت کا وہ سر جو بڑے بڑے جبّاروں کے سامنے بھی نہیں جھکا تھا، ڈاکٹر انصاری کے بوٹ پر جھک گیا۔ آنسوؤں نے اس کے گرد وغبار کو دھویا اور لب نے اس کے بوسے لئے اور گاڑی اسلامی غیرت وحمیّت کے ان گہرہائے گراں مایہ کو لے کر بڑھ گئی۔ چند مہینوں کے بعد جنگ کے اختتام پر جب ڈاکٹر انصاری اپنا یہ طبّی وفد لے کر ہندوستان واپس آئے ہیں تو مولانا اتّفاق سے بمبئی میں تھے۔ وہ جہاز سے اترے تو مولانا نے اُن کے پاؤں دوبارہ چومنے چاہے۔ ڈاکٹر صاحب نے معذرت چاہی تو فرمایا:۔

"یہ تمھارے پاؤں نہیں، اسلام کے مجسّمۂ غیرت کے پاؤں ہیں!"

ترکوں کی اعانت فرضِ عین اور قربانی واجب ہے

جنگِ طرابلس کے زمانے میں بقر عید کا زمانہ آگیا تھا۔ مولاناؒ کو خیال ہوا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اس سال قربانی کے روپے ٹرکی فنڈ میں داخل کردیں، تو اچھا ہے کہ قربانی کا روپیہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، جو اس وقت اپنی حقیقی قربانی کر رہے ہیں۔ فقہ کی رو سے انھوں نے اس پر غور کیا تو ان کو کوئی مانع نظر نہیں آیا۔ اس باب میں علمائے کرام سے فتویٰ طلب کیا، تو سب نے تائید کی۔ ادھر تسلّی ہوگئی تو اس تحریک کو اخباروں میں پیش کیا اور وہ چل پڑی۔ اس طرح ہزاروں روپے اس فنڈ میں جمع ہوگئے۔ بعض علماء نے اُن کے اس فتوے سے اختلاف بھی کیا۔ چنانچہ مولوی ظفر علی خاں نے مولانا

کو اپنا شبہ لکھ بھیجا تو مولانا نے ان کو اس کے جواب میں لکھا:-

" بھائی! ترکوں کی اعانت اس وقت فرضِ عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنّت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنّت مقصود ہے۔ فرق یہ ہے کہ آپ اس سنّت کو لیتے ہیں، جس کا مینڈھے پر عمل ہوا۔ اور میں وہ پیشِ نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی۔ کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے۔؟"

سیرت النبیؐ اور خاتمہ بالخیر!

اُردو میں جب ناموران اسلام کا سلسلہ چھڑا تو بار بار مولانا کے دل میں خیال آیا کہ ان ناموروں میں سب سے پہلے اس نامور کا نام آنا چاہیئے۔ جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا۔ فرماتے تھے کہ سوانح عمری ایسی لکھنی چاہیئے جس سے صاحبِ سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے۔ لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرورِ کائنات کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔ غالباً اسی خیال کا ایک عکس ان کے اس قطعے میں ہے ؎

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالم ❊ دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود رُوح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی ❊ کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

چنانچہ ۱۹۱۲ء کے الندوہ میں سیرت نبوی کی تالیف کا برملا اعلان کردیا

اور قوم سے اس کے ماہانہ مصارف کے لئے ڈھائی سو ماہوار اور خرید کتب کے لئے کچھ اور نقد روپے کی درخواست کی۔ اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو لبیک کہا اور فالِ نیک یہ کہ اس دوران میں ایک مرتبہ مولانا بمبئی جاتے ہوئے بھوپال اُترے۔ نوّاب سلطان جہاں بیگم سرکار عالیہ بھوپال نے شرفِ ملاقات بخشا۔ اسی موقعہ پر مولانا نے اپنا یہ قطعہ پڑھ کر سنایا۔

عجم کی مدح کی، عبّاسیوں کی داستاں لکھی۔ مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم - خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سرکار عالیہؒ اس کو سن کر بے حد متاثر ہوئیں اور سرکارِ بھوپال سے سیرت کی امداد کا اجرار دو سو ماہوار کے حساب سے صرف دو برس کے لئے ہو گیا۔ یہ زمانہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی اہم کتاب کے لئے بہت ہی کم تھا۔ چنانچہ مولانا نے منشی محمدؒ امین صاحب زبیری کو جو ہز ہائی نس نوّاب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال کے لٹریری سیکریٹری تھے، لکھا۔

"میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہو گا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کر دیں، لیکن اب روپے کا نہیں میری جان کا معاملہ ہے۔ ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا، جس کی توقع کئی برسوں تک نہیں ہو سکتی۔"

دو برس تمام ہوتے ہوتے سرکار عالیہ نے اپنی امداد کی مدّت تا تکمیل بڑھا دی۔ اس سے خوش ہو کر مولانا نے یہ قطعہ کہا اور اس کو منشی محمدؒ امین صاحب

کے خط میں لکھ کر بھوپال بھیج دیا ہے

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں بہر صورت : کہ ابرِ فیضِ سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقیدِ روایت ہائے تاریخی : تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل : کہ جس میں اک فقیرِ بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

خودداری

مولانا اگرچہ مغرور نہ تھے، تاہم وہ فطرۃً سخت خوددار تھے۔ حیدرآباد کی ملازمت سے چند ہی سال بعد ان کو الگ ہونا پڑا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امراء کے سامنے سر جھکانا اپنی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں نوّاب محسن الملک بہادر کو تحریر کرتے ہیں:

"مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ اور کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں۔ میرا رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہوا ہے لیکن دنیا کو سلیقے کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دربار داری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم۔ اس لئے میں نے گوشۂ عافیت پسند کیا۔"

※ ※ ※

امراء کی قصیدہ خوانی سے احتراز

سنہ ۱۹۰۲ء میں جب مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر ہوئے تو بحیثیت ملازم سرکار وہ بھی ان کو نذر دینے گئے۔ تو ان کو ایڈیکانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا۔ تو انھوں نے ذرا تیکھے ہو کر کہا:-

"یہ اوروں کا پیشہ ہے، میں یہ کام نہیں کرتا۔"

ذکی پاشا کے نذرانے سے انکار

نذر و نیاز کے طریقے کو بھی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور اس پر کتنا ہی خوش نما پردہ ڈالا جائے۔ لیکن اس سے احتراز کرتے تھے ایک بار ٹرکی کے سفر میں اس سلسلے کا نہایت بدنما منظر سامنے آیا۔ مولانا مکتبِ حربیہ کے سکرٹیری ذکی پاشا سے ملنے گئے۔ شیخ علی ظبیان بھی ساتھ تھے اور دونوں عربی لباس میں تھے۔ اگرچہ مولانا کے سر پر ریشمی عمامہ اور کمر میں سنہری پیٹی تھی لیکن قفطان اور عبا کی وجہ سے مجموعی صورت سے عرب معلوم ہوتے تھے۔ پاشا موصوف کو اس وقت نہایت جلدی تھی۔ سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں نکالیں۔ پہلے تو مولانا کو سخت تعجب ہوا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نعوذ باللہ انھوں نے گداگر سمجھا۔ اس خیال کے ساتھ مولانا کو نہایت رنج اور رنج کے ساتھ غصہ آیا اور چلا کر کہا:-

سو هذا ملجئنا لهذا، لسنا من الفقراء یعنی یہ کیا ہے؟ ہم اس سلئے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں پاشائے موصوف نے شیخ علی ظبیان سے مولانا کے غصّے کی وجہ پوچھی انھوں نے مولانا کے آنے کی غرض وغایت بیان کی تو پاشائے موصوف کو سخت ندامت ہوئی اور معذرت کے ساتھ کہا کہ آپ بالاخانے پر چلئے میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ مولانا اس واقعے کی تفصیل لکھنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"مجھ کو اس بات کے معلوم ہونے سے کہ یہاں علماء اور متقوّفین جب کسی امیر یا عہدہ دار سے ملتے ہیں تو اس غرض سے ملتے ہیں کہ ابیضِ نورانی ہاتھ آئے، ذکی پاشا کی بدگمانی کا رنج تو جاتا رہا۔ لیکن اس فرقے کے حال پر بہت افسوس ہوا۔ نذرونیاز کے طریقے کو میں ہندوستان کے ساتھ مخصوص سمجھتا تھا: لیکن افسوس یہاں بھی اس سے نجات نہ پائی"۔

ء۱ مجیدی۔ ایک ترکی سکہ۔

ندوے کے چندے کے لئے انوکھی تحریک

ندوے کی کامیابی کے لئے اگرچہ وہ ہر قسم کی کوششیں کرتے تھے، تاہم اس کے لئے بھی ان کا لب سوال بہ مشکل کھلتا تھا۔ شملہ ڈیپوٹیشن میں گئے تو اپنے لکچر میں نہایت دبی زبان سے چندے کی تحریک کی تو یہ شعر پڑھا ؎

عاشقِ تازہ ہوں اور وصل کی اوّل شب ہے ٭ شرم سے کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا مطلب ہے

علما اور گداگری!

ایک بار کسی جشن کے موقعے پر ندوے کی طرف سے نواب صاحب بھاول پور کی خدمت میں دعانامہ بھیجنے کی تحریک ہوئی اور مولانا سے دعانامہ لکھنے کی خواہش کی گئی تو انھوں نے اس کو سخت ناپسند کیا اور لکھا:۔

"میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ نہایت دناءت کی بات ہے کہ موقعِ جشن پر اور منگتوں کی طرح ندوے کا وفد بھی اپنا بھجن گانے گا۔ علما کی شراکت اس قسم کے خیالات پیدا کرتی ہے۔"

جھوٹی سفارش سے نفرت

سفارش نیکی کا کام ہے۔ مگر مولانا کا عمل اس کے برخلاف تھا۔ اس میں ایک نوان کی خودداری کو دخل تھا کہ وہ اس کو بھی امرا کے سامنے اظہارِ حاجت ہی سمجھتے تھے جس سے ان کو ہمیشہ اجتناب رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ افرادِ قوم کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خود اپنی سفارش کر سکیں۔ مولوی منصور احمد ایم۔اے علی گڑھ سے تحصیل عربی کے لئے یورپ جا رہے تھے۔ اور سرکاری وظیفے کے لئے سند چاہتے تھے۔ اگرچہ خود ان کو ڈاکٹر ہارویز۔ سرٹیفکیٹ دینے والے تھے لیکن انھوں نے مولانا سے بھی سند لینی چاہی اور چوں کہ وہ مولانا کے مذاق سے واقف تھے اس لئے نمونے کے طور پر عربی عبارت بھی لکھ بھیجی۔ اس کے متعلق مولانا، مولوی ضیاء الحسن صاحب ندوی کو جو

اس وقت کالج میں تھے لکھتے ہیں :۔

"عربی عبارت تو بہت معمولی ہے۔ اس سے گئی گزری اور کیا ہوتی ۔ سرٹیفکیٹ لکھوں گا، تو یہ لکھوں گا کہ عربی عبارت معمولی لکھ سکتے ہیں۔"

اظہارِ رائے میں بے باکی

مولانا اپنی جو رائے قائم کر لیتے تھے اس کے اظہار میں بے باک تھے اور اگر ان کے سامنے کبھی یہ تذکرہ آتا کہ فلاں کام سے فلاں شخص ناراض ہو جائے گا تو فرماتے تھے :۔

"میں کب یہ چاہتا ہوں کہ تمام دنیا مجھ سے خوش رہے" اور اس کے ساتھ یہ شعر پڑھتے تھے ؎

خاطرِ یک دو کس ارشاد شود از تو بس است ؛ زندگانی بمرادِ ہمہ کس نتواں کرد "

بمبئی میں قیام، خلوت گزینی کی مصلحت پر تھا

بمبئی کو اُنھوں نے جس اسباب کی بنا پر پسند کیا تھا ، ان میں ایک خلوت گزینی بھی تھی۔ فرماتے تھے۔

"یہاں شبلی پڑا پھرتا ہے، اور کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ شبلی ہے۔"

حیدر آباد میں نظامتِ علوم و فنون کی خدمت

مولانا جب حیدر آباد بسلسلۂ ملازمت تشریف لے گئے تو وہاں ان کے

فرمتے علوم و فنون کا شعبہ سپرد کیا گیا اور وہ اس شعبے کے ناظم مقرر کئے گئے
اس کی اطلاع اپنے علم دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو دیتے ہیں:۔

"ہاں میں نے نظامتِ علوم و فنون کی خدمت تو قبول کرلی ہے، لیکن اس انقلاب میں (حیدرآباد کے انقلابِ وزارت کی طرف اشارہ ہے) دیکھئے یہ خدمت بھی مجھ کو قبول کرتی ہے یا نہیں۔"

لیس الذکر کالانثیٰ[۱]

ایک خط میں مولانا آزاد کو لکھتے ہیں:۔

"کیا شبلی کو رابعہ[۲] کا درجہ مل سکتا ہے لیس الذکر کالانثیٰ۔"

۱ـ لیس الذکر کالانثیٰ ۔ لڑکا، لڑکی طرح نہیں ہوتا
۲ـ بصرے کی ایک زاہدہ جو اپنی پاک دامنی کے لئے مشہور تھیں۔ اُنھوں نے ایک نہر بغداد سے مدینے تک بنوائی تھی۔ ان کو بہت سی احادیث یاد تھیں۔

بارِ خاطر ہونے سے احتراز

دیکھئے کس طرح عطیہ بیگم کی محبت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔
ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

میں بارِ خاطر ہونے سے بہت پرہیز کرتا ہوں۔ جب میں وہاں تھا یا جب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کا ہر وقت کھٹکا رہتا ہے کہ میری ملاقات سے آپ گھبرا نہ گئی ہوں۔ یہی حالت خطوط لکھنے کی ہے اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ صاحبوں کے خطوط کبھی ابتداءً نہیں آتے۔ بلکہ میرے جواب میں آتے ہیں۔ تو سمجھ لیتا ہوں کہ کیوں بار بار زحمت دوں اور زبردستی جواب حاصل کروں۔ بہر حال مختصر نویسی کا یہ سبب ہے، ورنہ میں

دفتر لکھ کر بھی سیر نہ ہوں"

ناخواندہ مہمان، وبالِ میزبان

ایک دوسری جگہ زہرا بیگم کے خط میں تحریر کرتے ہیں:-

"عزیزی عطیہ کو سلام کہنا، لیکن پھر وہی خیال ہوتا ہے ناخواندہ مہمان کیوں بنوں۔"

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

عطیہ بیگم کا ارادہ لکھنؤ آنے کا ہے۔ لیکن قیام کا خیال کسی اور جگہ ہے۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔ سُننے اور مزے لینے کی بات ہے:-

"کل اتفاق سے مولوی شبیر حسین صاحب قدوائی ملنے آ گئے تھے۔ ان سے آپ کے لکھنؤ آنے کا ذکر آ گیا۔ انھوں نے کہا وہ میری مہمان ہوں گی۔ اس لیے یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر آپ لکھنؤ آ کر کسی اور کی مہمان ہوئیں تو میں اس زمانے میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

شبلی صاحبِ قلم نہ کہ صاحبِ دکان

ایک خط میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں:۔

"ولایت اگر ہندوستان کی مصنوعات میں سے کوئی چیز لے جانا ہو تو یہاں کی بعض نادر چیزیں بھیج دوں، لیکن خدا کے لئے زہرا صاحبہ کی طرح قیمت نہ دینے لگنا۔ میں نے ان کو قرآن مجید بھیجا تھا۔ وہ قیمت پوچھتی ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں شبلی صاحبِ قلم ہے، صاحبِ دکان نہیں۔"

ہم کوزہ گرو ہم گلِ کوزہ

۱۸۸۳ء میں مولانا شبلی علی گڈھ کالج میں عربی کے پروفیسر ہوئے۔ بڑی خوش قسمتی علّامہ شبلی کی یہ تھی کہ وہاں پروفیسر آرنلڈ ایسا علم دوست اور سرسیّد جیسا سچّا محب اور پرجوش معاون اور علم وادب کا صحیح راہ نما ان کو ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کو شبلی ان ہی دو شخصیتوں نے بنایا۔ چنانچہ ایک جگہ خود ان دونوں کے اثرات کا نقشہ اشاروں میں یوں کھینچ دیا ہے:۔

"میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں، اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔"

فرقِ مراتب کا اثر

جب مولانا شبلی کالج میں بالکل نئے نئے تھے اور چالیس روپے

تن خواہ پاتے تھے۔ (آگے چل کر مولانا کی تن خواہ سو روپے ماہوار ہو گئی تھی) اس زمانے میں کالج میں کوئی تقریب تھی، جس میں سب اساتذہ شریک تھے تعلیمی اداروں میں ہر استاد اپنے شعبے کو باقی سب سے اہم سمجھتا ہے، اس لئے ایسے موقعوں پر عموماً تن خواہ کے لحاظ سے کرسیاں بچھائی جاتی ہیں، اور چوں کہ شبلی تن خواہ میں سب سے نیچے تھے، ان کی کرسی بھی سب سے پیچھے بچھائی گئی۔ اس بات کا شبلی کی حساس طبیعت پر حد سے زیادہ اثر ہوا۔ چنانچہ فرماتے تھے:-

"بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے، مگر آنکھ پرنم ہوئے بغیر نہ رہی۔"

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

جس وقت حیدر آباد میں مولانا شبلی کا معاملہ درپیش تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک دماغی کش مکش میں مبتلا تھے۔ ان کی خود دار طبیعت اور ذوقِ علمی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ملازمت کی زنجیروں میں نہ پھنسیں اور دنیوی حالات اس تعلق پر مجبور کر رہے تھے اس سلسلے میں مولوی سمیع صاحب کو لکھتے ہیں:-

"بہر حال دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بے شبہ اگر ملازمت کر سکتا اور کسی قدر دنیاداری بھی مجھ سے بن پڑتی، تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے، لیکن میاں سمیع! عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا۔ چند برسوں کے لئے دامنِ زندگی کو کیا آلودہ کروں۔ دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی ہے،

بلند رہے۔"

اس کے چند روز بعد انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لیا، لیکن ذہنی کش مکش اب بھی قائم رہی۔ فرماتے ہیں:۔

"میں یہاں آکر ایسا پھنس گیا کہ ع نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔"

ریاستوں کے ساز باز!

مولانا شبلی کو حیدرآباد میں ملازمت مولوی سیّد علی بلگرامی کی مدد اور مدارالمہام نوّاب وقارالامراء کی عنایت سے حاصل ہوئی تھی، لیکن ریاستوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ چند ماہ بعد نوّاب وقارالامراء مدارالمہامی سے مستعفی ہو گئے۔ اور مولوی سیّد علی بلگرامی کو ریاست نے الگ کر دیا۔ شبلی ان کے متوسلین میں تھے۔ ان کی ملازمت بھی معرضِ خطر میں پڑ گئی۔ اس سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:۔

"یہاں ہر روز ایک نیا شگوفہ کھلتا ہے۔ سیّد علی نکل چکے اور لوگ نکالے جاتے ہیں۔ میرا بھی نفس باز نہیں ہے۔"

"ہم لوگ اتنے سستے داموں نہیں بکتے!"

مولانا کو اپنی فارسی نظموں کے طبع کرانے کا خیال بہت دنوں سے تھا۔ ان کے دوست نوّاب سیّد علی حسن خاں صاحب نے جو خود بھی فارسی

کے شاعر، اور اس زبان کے جوہری تھے، مولانا کو لکھا کہ وہ اِن اَن مول موتیوں کا ہار اہلِ نظر کے بازار میں پیش کرنا چاہتے ہیں یعنی وہ خود اس کو چھپوانا چاہتے ہیں۔ مولانا نے یہ سمجھ کر کہ شاید وہ اس طرح میری امداد کرنا چاہتے ہیں، ان کے خط کا بُرا مانا اور ان کو جواب میں لکھ بھیجا:۔

" ہم لوگ اتنے سستے داموں نہیں بکتے"

زبانِ خلق کا پاس!

۱۸۹۹ء میں یورپ (اٹلی) میں علومِ مشرقیہ کے علماء کا ایک اجتماع تھا، جو اورنٹیل کانفرنس کے نام سے موسوم تھا۔ یہ نہایت معزز کانفرنس تھی، اور تمام یورپ و مصر و شام کے علماء جمع ہونے والے تھے۔ ریاست حیدر آباد سیّد علی بلگرامی کو اس کی شرکت کے لئے بھیجنے والی تھی، اور پنجاب گورنمنٹ مسٹر آرنلڈ کو۔ مولانا کا بھی اس میں شریک ہونے کا ارادہ تھا۔ چنانچہ نواب سیّد علی خاں کو بھوپال لکھا کہ آپ بھی قصد کریں تو متعدد فائدے ہیں: "ریاست کی ناموری، آپ کو یونی ورسٹی کا فیلو بننا آسان ہوگا، آپ کے عہدۂ ڈائرکٹری کی گورنمنٹ کے نزدیک نہایت وقعت بڑھ جائے گی، واپسی کے وقت مصر و قاہرہ کی سیر، لطفِ صحبت الگ، خرچ بہت سے بہت ایک ہزار مع خرچ واپسی۔ جواب سے مطلع فرمایئے۔" نواب صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ بجائے ذاتی خرچ کے قومی خرچ سے جائیں۔ مولانا نے جواب دیا:۔

"آپ کو تو یہ پہلو پیشِ نظر ہے کہ قوم نے مل کر ایک اچھا کام کیا اور عام زبانوں پر یہ ہوگا کہ شبلی دریوزہ گری کر کے یورپ گیا۔"

اونٹوں کی زبان!

قسطنطنیہ کے سفر میں مسٹر آرنلڈ مولانا کے ساتھ تھے، اور مولانا سے عربی پڑھا کرتے تھے۔ جہاز پر اسپین کا ایک عیسائی بھی ساتھ تھا، جو مسٹر آرنلڈ کے عربی پڑھنے سے نہایت جلتا تھا اور تحقیر کے ساتھ عربی حرفوں کو نہایت بُرے لہجے میں ادا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ اونٹوں کی زبان ہے۔ مولانا سفرنامے میں اس واقعے کو لکھ کر تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ مجھ کو اس کی ان حرکتوں سے رنج ہوتا تھا، لیکن جو قوم ایک مدّت تک ذلّت کے ساتھ عربوں کی زیر دست رہ چکی تھی، عرب وہ عربی زبان کے ساتھ اس کا یہ سلوک بے جا نہ تھا۔"

شدّتِ غم

بھائیوں سے اس قدر الفت تھی کہ مہدی مرحوم نے انتقال کیا تو مولانا نے ہفتوں تک کسی سے بات چیت تک نہ کی۔ مولانا عبدالسلام صاحب نے پوچھا کہ آپ نے ان کا مرثیہ کیوں نہیں لکھا؟ تو بولے:۔

"حواس کب بجا تھے۔"

نالۂ جاں ستاں!

دوسری بیوی سے بھی بہت محبّت رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا انتقال ہوا تو فرماتے تھے کہ

"میں اس زور سے چیخ کر رویا کہ خود مجھے اپنی جان کا خوف پیدا ہوگیا"

"پہلے چھوٹی بھاوج تھی اب پیاری بہن ہے"

اپنے منجھلے بھائی مہدی کی وفات کی مولوی سمیع صاحب کو بڑے موثّر اور زہرہ گداز الفاظ میں اطلاع دی ہے، اور اس سلسلے میں لکھّا ہے:-

"اس کی ایک محبوب یادگار ہے جس کو وہ بیبن کہتا تھا یعنی شافیہ (مہدی مرحوم کی یتیم لڑکی کا نام) اس سے بارہا لپٹ کر رویا ہوں، لیکن کچھ بھی تو تسلّی نہیں ہوتی، اس کو تسلّی دینا چاہتا ہوں، لیکن خود بے قرار ہوجاتا ہوں۔ ایک اور اس کے نام سے والبتہ بدقسمت ہے، جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی، لیکن اب پیاری بہن ہے"

صحّتِ کامل پر ایک شاندار دعوت کا عزم

مولانا کا ارادہ تھا کہ اگر خدا نے انھیں صحّتِ کامل دی، تو وہ اپنے تمام مخلص دوستوں کی ایک شاندار دعوت کریں گے۔ اس سلسلے میں مولانا شروانی

کو لکھتے ہیں :۔

"آپ کو بھی تکلیف کرنی پڑے گی، ورنہ اپنے نیازمندوں کی فہرست سے میرا نام آپ کو نکال دینا ہوگا۔"

"متحرک مُردہ"!

حکیم غلام غوث صاحب بھاول پوری طبیب سرکاری کے یہاں بچہ ہوا تھا۔ اُنھوں نے بچے کی ولادت کا قطعۂ تاریخ یا قصیدۂ دعائیہ لکھنے کی مولانا سے فرمائش کی تھی۔ اس پر اپنی معذوری ظاہر کرتے ہیں :۔

"اخبارات میں نظمیں دیکھ کر آپ مجھ کو زندہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن کبھی اتفاق ہو تو آپ کو رحم آئے گا کہ ایک مردۂ متحرک فرمائش کے لئے موزوں نہیں۔"

ابتذال بمنزلہ ازالہ حیثیتِ عرفی

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی "الندوہ" کے سب ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے ایک بار الہ آباد کے رسالہ ادیب پر "الندوہ" کے ایڈیٹوریل میں ریویو کرتے ہوئے یہ لکھا کہ "حال میں الہ آباد سے ادیب ظاہری شکل وصورت میں اس آب ورنگ سے نکلا کہ تمام لوگ پکار اُٹھے ع اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو" چوں کہ یہ ریمارک ایڈیٹوریل میں لکھا گیا تھا، اس لئے لوگوں کو گمان ہوسکتا تھا کہ یہ مولانا کے قلم سے نکلا ہوا ہو۔ اس لئے مولوی عبدالسلام کو ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے سے

آیندہ باز رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"رسالہ ادیب کی نسبت تم نے جو ریمارک لکھا ہے، وہ ایڈیٹوریل میں لکھا، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ میرا لکھا ہوا ہے۔ مجھ کو اس سے نہایت افسوس ہوا۔ میرا وہ طرزِ عبارت نہیں ہے۔ اور جو مصرع تم نے نقل کیا، اس کو تو میں اپنے حق میں ازالۂ حیثیتِ عرفی سمجھتا ہوں۔"

ہمدردی

مولوی محمد ریاض حسن خاں صاحب خیالؔ رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کی والدہ ماجدہ نے انتقال کیا تھا۔ ان کی تعزیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"میں اس دولت کو آغازِ شباب میں کھو چکا ہوں، لیکن اب تک یہ حالت ہے کہ کسی کو جب دیکھتا ہوں کہ اس کے والدین سر پر موجود ہیں، تو بخدا عجب حسرت ہوتی ہے۔ آپ کے رنج و افسوس کا کچھ میں ہی خوب اندازہ لگا سکتا ہوں۔"

بمبئی کے تاجرانہ ماحول میں ٹکسالی اُردو کی کساد بازاری!

ایک جگہ بمبئی کے تاجرانہ ماحول میں اپنی ٹکسالی اُردو کی کساد بازاری کو کس حسرت کے ساتھ ظاہر کیا ہے:۔

"یہاں بھی لکچروں کی کثرت ہے۔ کل ایک لکچر تھا۔ آیندہ ایک بہت بڑے مجمع میں لکچر دینا ہے۔ لطف یہ ہے کہ سامعین سب بنیے اور تاجر ہیں۔ جو ہماری

اردو تک نہیں سمجھتے۔ ان میں ہماری پیری کیا چل سکتی ہے!"

جنسِ لطیف یا فاتح القلوب

۱۹۰۸ء میں جب انور بے وغیرہ کے زیرِ علم ٹرکی نے دستوریت کا اعلان کیا، تو مولانا خوشی میں آپے سے باہر تھے۔ ایک ایک نامور نوجوان ترک، اور انجمنِ اتحاد و ترقی" کے ایک ایک جان باز رکن کی تعریفیں کرتے تھے۔ ایک خط میں ایم مہدی مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"ٹرکی کی جدید زندگی نے اس کے ہوا خواہوں کو مخمور کر دیا ہے۔ کیا بتاؤں عربی اخبارات میں آج کل کیا نشہ ہوتا ہے، سو سو دفعہ پڑھتا ہوں اور سیر نہیں ہوتا۔ آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے، ان میں بیس ہزار کی جمعیت کا ایک کمانڈر، ایک جنسِ لطیف تھی۔ اس فوج کا کیا عالم ہو گا، جو قدرتی اور نیچرل فاتح القلوب ہیں؟ ان کی سپہ سالاری کیا قیامت ڈھالے گی۔"

ابتداءً خط نہ لکھنے کا حسین عذر

ایم مہدی حسن کو ایک مختصر خط لکھا ہے۔ اس میں اختصار کا عذر، اور ممدوح کو ابتداءً خط نہ لکھنے کی شکایت کا رد کس خوبی سے کیا ہے:

"اور لکھتا، لیکن ایک جنسِ لطیف (غالباً عطیہ صاحبہ مراد ہیں) کا خط سامنے ہے، اور جواب لکھنا ہے۔ اس فرعونیت کو دیکھیے

کہ ان شاہنشاہوں کو بھی ابتداءً نہیں لکھتا پھر آپ کو شکایت کا کیا موقع ہے؟"

علم دوستی، قدر شناسی اور ہم عصروں اور شاگردوں سے تعلّقات

شبلی کا اپنے سوانح نگار کو ایک دل چسپ مشورہ

مولانا کی ترتیب سوانح کی سعادت کے سب سے بڑے خواہش مند منشی سیّد افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم تھے وہ چاہتے تھے کہ جس طرح اُنھوں نے شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم کی لائف لکھی ہے کہ طرزِ انشا کے پہچاننے والوں کو وہ بظاہر خود صاحبِ سوانح کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح وہ مولانا کے سوانح کی بھی تالیف کریں، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں اُنھوں نے خود مولانا سے خواہش کی، مگر مولانا نے اس کو کسی طرح قبول نہیں کیا چنانچہ مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں :-

" ہاں اور سُنیے ! افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر ان ہی آلودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلی کو چھونا چاہتے ہیں ۔ اجازت اور حالات مانگتے ہیں۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ

ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مِل جائیں گے، لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے، وہاں سے منگوایئے۔ بھئی، بتا تو نہ دوگے؟"

منشی سیّد افتخار عالم صاحب مولانا کے اس انکار کے بعد بھی اپنے خیال سے باز نہ آئے۔ چنانچہ پانچ برس کے بعد پہلے تو خود مولانا کو لکھا۔ اُنھوں نے ۲۵ر جنوری ۱۹۱۴ء کو یہ ظریفانہ جواب دیا:-

"میری لائف میرے بعد لکھیے گا، ورنہ مکمّل لائف کیوں کر ہوگی۔"

ایک جلسے میں شبلی کی آمد پر تالیاں اور ایک کہنہ خیال مولوی کی غلط فہمی

ایک مرتبہ مولانا شبلی کسی تقریب سے رام پور میں وارد تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں مرحوم نے اس حُسنِ اتفاق سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ چنانچہ ایک عام جلسہ کیا اور لوگوں کو شرکت کی دعوت دی۔ جس میں بعض علما بھی تشریف لائے، تو جنرل صاحب نے ان کی آمد پر چیرز دیئے، اور ساتھ ہی ساتھ سب نے تالیاں بجائیں۔ علمائے حاضرین میں سے ایک بزرگ نے اپنی پرانی تہذیب کے مطابق یہ سمجھا کہ لوگ اس طرح تالیاں پیٹ کر مولوی شبلی کی توہین کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے چپکے سے اپنے ساتھیوں سے کہا:-

"مولوی شبلی کیسے ہی بد دین سہی، مگر وہ ہمارے مہمان تھے۔

جنرل صاحب کو یہ توہین کرنی نہیں چاہیئے تھی۔"

اب جنرل صاحب مقرر کے تعارف کو کھڑے ہوئے، تو خود ان بزرگ نے تالیاں بجائیں، اور اپنے ساتھ والوں سے بھی کہا کہ خوب تالی پیٹو۔ انھوں نے مہمان کی توہین کی ہے ان کی بھی توہین کرو۔ اس طرح مہمان کی توہین کا انتقام لے کر وہ ناراض ہو کر جلسے سے اُٹھے اور اپنی پالکی پر بیٹھ کر واپس جانے لگے۔ جنرل صاحب کو ان کی ناراضگی کا علم ہوا تو جا کر معذرت کی اور بتایا کہ یہ مہمان کی توہین نہیں، بلکہ اس کو شاباشی دی گئی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی سے تعریف کے قابل کوئی بات ہوتی ہے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔ اب اگر ہر شخص اس کی پیٹھ ٹھونکے تو اس کی پیٹھ ہی زخمی ہو جائے۔ اس لئے اب یہ کرتے ہیں کہ اپنے ایک ہاتھ کو اس کی پیٹھ فرض کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے اس کو ٹھونکتے ہیں۔ یہ تالی نہیں ہے۔ اس تاویل سے ان نیک نہاد بزرگ کی تسکین ہو گئی اور جلسے میں واپس تشریف لائے۔

شیر پلونا غازی عثمان پاشا اور مولانا شبلی میں دست بوسی کے لئے مسابقت!

مولانا نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الفاروق" کے لکھنے کے لئے مصر و شام اور قسطنطنیہ کا بھی سفر کیا۔ جب وہ قسطنطنیہ پہنچے، تو شیر پلونا غازی عثمان پاشا کی زیارت کا شوق ان کے دل میں قدرتی طور پر

پیدا ہوا۔ یہی کشش ان کو غازی موصوف کے درِ دولت تک کھینچ لے گئی۔ ملاقات کے وقت جب ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں تھا، مولانا نے غازی سے درخواست کی کہ جس ہاتھ سے آپ نے کفّار کو قتل کیا تھا اس کے چومنے کی مجھ کو اجازت دیجئے۔ پاشا نے کہا کہ آپ کا ہاتھ چومنے کے قابل ہے، جس نے علمی خدمات انجام دی ہیں اور یہ کہہ کر مولانا کا ہاتھ چوم لیا۔

کتب بینی کا شوق

مولانا کو بچپن سے کتب بینی کا نہایت شوق تھا۔ جب اعظم گڈھ میں ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے، تو روزانہ ایک کتب فروش کی دکان پر جاکر فارسی کتابیں دیکھا کرتے تھے۔ بڑے مزے کی بات تو یہ تھی کہ باوجود اس شوق کے کتاب کا مطلب نہیں سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے:۔

"صفحے کے صفحے پڑھ جاتا ہوں، لیکن صرف ایک آدھ لفظ اور ایک آدھ سطر سمجھ میں آتی تھی اور اُسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔"

حالی کا مزاح

مولانا حالی مولانا شبلی کی تصنیفات کو شوقیہ منگاتے تھے اور لائبریری میں رکھتے تھے۔ ایک بار مولانا کی چند کتابیں لائبریری کے لئے منگائیں اور لکھا کہ خود آنکھوں سے معذور ہوں، لیکن دوسروں کے لئے

منگوائی ہیں کہ

"قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی"

حالیؔ سے عقیدت

مولانا نے اپنے معاصرین کے ساتھ اور ان کے معاصرین نے ان کے ساتھ ہمیشہ خوش گوار تعلّقات رکھے"۔ دونوں نے ایک دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کیا۔ اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبّت اور الفت تھی۔ فرماتے تھے:۔

" میں دریا ہوں اور حالی کنواں۔ میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں، لیکن وہ گہرے ہیں۔ جب تک کافی موادِ تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا"

مولانا نذیر احمد کا مولانا شبلی کو خراجِ عقیدت!

مولوی نذیر احمد اور مولانا شبلی میں اگرچہ وہ ربط و ضبط و اخلاص نہ تھا جو مولانا کو مولانا حالی کے ساتھ اور مولانا حالی کو مولانا کے ساتھ تھا، تاہم بالکل بے تعلّقی بھی نہ تھی۔ کانفرنسوں کے اجلاس میں اکثر

دونوں بزرگ ایک ساتھ پبلک اسٹیج پر نظر آتے تھے اور ایک دوسرے کے متعلق جو کچھ کہتا تھا، اس سے تکلّفانہ تعلّقات کی جھلک نمودار ہوتی تھی۔ ایک بار اسٹریچی ہال میں کانفرنس کا ایک اجلاس ہوا، تو مولوی نذیر احمد نے اپنی تقریر میں ظریفانہ لہجے میں کہا :۔

"میں نے کسی زمانے میں عربی اچھّی پڑھی تھی۔ اب تو ایسا ڈھول ہوگیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں، تو بغلیں جھانکنی پڑیں۔"

"آزاد اُردوئے معلّیٰ کا ہیرو ہے"

مولانا محمّد حسین آزاد سے تعلّقات نہ تھے۔ ان سے صرف ایک بار لاہور میں ملاقات ہوئی تھی، جب کہ ان کا دماغ خراب ہوچکا تھا۔ بایں ہمہ مولانا اُن کو اُردو کا سب سے بڑا انشا پرداز جانتے تھے اور فرماتے تھے :۔

"آزاد اُردوئے معلّیٰ کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصل معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔"

احساسِ برتری

مولانا جس زمانے میں "شعر العجم" لکھ رہے تھے، آزاد کی کتاب "سخندانِ پارس" نکلی۔ اس کی نسبت ایک دوست کو تحریر کرتے ہیں :۔

"آزاد کی کتاب دیکھو آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم

وہ اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا، تو وحی معلوم ہوتی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکچر تک، اس نے میری سرحد میں قدم بھی نہیں رکھا۔ بارہویں میں یہ میدان میں اُترا ہے، لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا، اس لئے یوں ہی سرسری چکّر لگا کر نکل گیا۔"

حُسنِ تردید!

خواجہ عزیزالدّین صاحب عزیزؔ لکھنوی سے نہایت وسیع تعلقات تھے۔ مولانا بعض فارسی تحریروں کے متعلّق خواجہ صاحب سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ ایک بار "النّاظر" نے مولانا کو خواجہ صاحب کا شاگرد لکھ دیا تھا۔ اس کی تردید میں مولانا نے لکھا:۔

"خواجہ صاحب میرے مخدوم ہیں، لیکن میں ان کا شاگرد نہیں ہوں۔"

خواجہ صاحب سٹھیا گئے ہیں!

ایک بار مولانا نے حضور نظام سابق میر محبوب علی خاں کی خدمت میں "ندوے" کی طرف سے ایک خریطہ پیش کرنے کے لئے یہ شعر لکھا تھا ؎

تا جہاں باشد و ایں گنبدِ گرداں باشد - دہر فرماں برِ محبوب علی خاں باشد

پھر یہ شعر بغرضِ مشورہ خواجہ صاحب کے پاس بھیجا۔ جو صاحب گئے تھے، اُنھوں نے آ کر کہا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ "گنبدِ گرداں"

کی ترکیب اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مولانا نے یہ سن کر فرمایا:
"اب ہمارے خواجہ صاحب سٹھیا گئے ہیں۔"

"سیرۃ النّعمان" اور "حسن البیان"

"سیرۃ النّعمان" کے جواب میں مولانا عبد العزیز صاحب رحیم آبادی نے "حسن البیان" نامی کتاب لکھی تھی۔ اس میں غلط فہمی کی بنا پر مولانا پر انگریزی لباس پہننے کا الزام لگایا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ "اتّفاق سے ایک جگہ میری ان کی ملاقات ہوئی، تو میں نے پوچھا کہ میں انگریزی لباس تو کبھی نہیں پہنتا۔ مولانا رحیم نے پشیمانی ظاہر کی اور فرمایا کہ میں نے یوں ہی سنا تھا۔"

مولانا شبلی کی دہلی میں تصوّف پر تقریر اور خواجہ حسن نظامی کا تاثّر!

آخر زمانے میں مولانا میں روحانی جستجو کی خلش پیدا ہوگئی تھی اور فلسفہ و حکمت کا نشہ ان کے سر سے اُتر چکا تھا، اور یہ کہنے لگے تھے

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیب ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

اسی زمانے میں مولانا نے بعض صوفیوں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ ۱۹۰۴ء میں جب اصلاحِ ندوہ کے سلسلے میں ان کو دہلی میں قیام کا اتفاق ہوا تو ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی کے حلقۂ مشائخ میں اُنھوں نے تصوّف

پر تقریر فرمائی، جو بڑی جامع و مانع و مؤثر تھی۔ تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا:

"اگر تصوّف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔"

مولانا شبلی پر ایک دیہاتی کے استفسار کا اثر!

مولانا باوجود خودداری کے بے حد منکسر المزاج تھے۔ ایک دفعہ لکھنؤ میں گولہ گنج کی ایک سڑک پر جہاں دار العلوم تھا، مدرسے سے نکل کر وہ اپنی قیام گاہ پر جا رہے تھے۔ سیّد سلیمان مرحوم بھی ساتھ تھے۔ اتّفاق سے کچھ دیہاتی مسلمان دھوتی باندھے پیچھے سے آ رہے تھے، جب وہ سیّد سلیمان مرحوم کے برابر آئے، تو چپکے سے ان سے پوچھا کہ "مولوی شبلی یہیں ہوں؟" سیّد صاحب نے کہا ہاں۔ وہ آگے بڑھ گئے۔ مولانا نے فرمایا یہ کیا کہتے تھے؟ سیّد صاحب نے کہا پوچھتے تھے کہ مولوی شبلی صاحب یہی ہیں۔ یہ سن کر مولانا مولانا مسکرائے اور فرمایا:

"خدا کی قسم مجھے ان کے اتنے سے فقرے سے جو خوشی ہوئی وہ بڑوں بڑوں کی تعریف سے نہیں ہوئی۔"

⁂ ⁂ ⁂

مولانا شبلی اور راجہ صاحب محمود آباد!

مسلم لیگ کے اختلاف کے زمانے میں کسی نے راجہ صاحب محمود آباد کی نسبت ان سے کہا کہ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ میں شبلی کو تباہ کر دوں گا، تو جواب میں کہلایا:

" راجہ صاحب مجھے آپ تباہ نہیں کر سکتے کیوں کہ میں زمین کی گھاس ہوں۔

آندھیاں اونچے درختوں کو گرا دیتی ہیں۔ زمین کی بے قدر گھاس کو نہیں۔"

جناب عبدالحمید صاحب پر مولانا شبلی کی پھبتیاں!

مولانا محمد سمیع صاحب (جو مولانا کے ایک عزیز اور ابتدائی شاگرد ہیں، جن سے ان کو محبت، بلکہ عشق تھا) کے خط میں ایک جگہ جناب عبدالحمید صاحب کا بھی ذکر آ گیا ہے، اُنھوں نے مولانا کو کوئی خط لکھا ہے جس میں اپنے ستم رسیدہ ہونے کا رونا رویا ہے۔ دیکھئے مولانا کس طرح ان کو بناتے ہیں:-

" میاں عبدالحمید صاحب کا خط آیا تھا۔ ان پر تو خدا جانے کیا ستم ہوا ہے، جس کا اُنھوں نے بڑا ماتم لکھا ہے۔ عشق کے اکھاڑے میں میرا شیر بھی اترا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ لکھتے ہیں: " میرا دل تو خود ہی ستم رسیدہ ہے،

میں کسی کی بات کی کہاں تاب لاسکتا ہوں" سچ ہی آخر قیس کا کوئی تو وراثت دار ہوتا۔ معلوم نہیں کہ ہمارے حضرت کو ابھی سے کیا روگ لگا، جس کا دکھڑا گایا جاتا ہے۔ اگر کچھ ہو تو میری طرف سے مبارک باد دینا۔ ایسے منحوس کا دنیا میں پیدا ہو کر آنا خدا جانے کس غرض سے ہے"

"سلاموں کا پشتارہ!"

مولانا نے مولوی محمد سمیع صاحب کو ایک خط لکھا ہے، جس میں مکتوب الیہ کے ذریعے اپنے بعض احباب و اعزّہ کو سلام و دعا لکھتے ہیں۔ اور ہر ایک سے اس کے مرتبے کے مطابق دل لگی کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ عبارت مولانا کی خوش طبعی اور بذلہ سنجی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"اچھا ذرا سلاموں کا پشتارہ تو سر پہ لو، اور سب کے حصّے کا تقسیم کر آؤ۔ جناب حافظ حبیب اللہ صاحب، جناب حافظ حسن صاحب، جناب منشی خدا بخش صاحب، (بوڑھے تو شاید ہوئے۔ چلو اب جوانوں سے شروع کرو) مولوی احمد اللہ صاحب فخر الملّت والدّین، کہیں ف اُڑا نہ جانا، منشی حسن رضا خاں صاحب، منشی ولی میاں صاحب، (ہماری شادی ٹھہراتے ہی رہ گئے) میاں غلام حسین صاحب، ہی ہی سخت غلطی ہوئی ان کا نام کسی کے نام کے ساتھ ملا کر یا نیچے لکھنا تھا، اگرچہ ٹاٹ میں مونج کا بخیہ سمجھا جاتا، مکرمی مولوی محمد عمر صاحب، کیا خطوں کا جواب نہیں دیتے،

تو سلام کا جواب بھی نہ دیں گے ، افتخار القوم حضرت ماموں محمد سلیم صاحب دام فیضہٗ علینا ، جناب مولوی محمد حسین صاحب) مگر جانے وہ کہاں ہوں ۔ میرا سلام مفت میں خاک چھانتا پھرے ، کوئی بھول تو نہیں گیا ' آہا مرزائے مختصر میاں سلیم اللہ صاحب رہ گئے ' اتنا سا تو قد مجمع میں نظر آئیں تو کیوں کر ، ایک اور میرا مایۂ فخر و ناز رہ گیا ، جناب مولوی مرزا محمد سلیم صاحب ، خیر ' اُنھیں کے صدقے مرزائے مختصر بھی یاد آ گئے ۔ اب تو چھوٹے چھوٹے عزیز رہ گئے ۔ ان کو میرا سلام و دعا دونوں) ، سب کے نام کی تو اب جگہ نہیں (کاغذ میں ، ورنہ دل میں تو سبھوں کی جگہ ہے) ایک دو کا نام سن لو ، محمد عثمان ' سلیمان ' یونس ، علاء الحق ۔ "

مولانا شروانی کو نعت گوئی کی بجائے درود خوانی کا مشورہ

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مولانا کو اپنی ایک نعتیہ غزل ملاحظے کے لئے بھیجی ہے ۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

" والا نامہ اور اشعار پہنچے ۔ علمائے ادب کہتے ہیں کہ حسّان رضؓ جاہلیّت کے نامور شعراء میں تھے ، لیکن اسلام آیا اور نعت کہنی شروع کی ، تو ان کا کلام رتبے سے گر گیا ۔ آپ بھی اس میدان میں آئیے ۔ ثواب مقصود ہو تو درود پڑھ لیا کیجئے "۔

لیلیٰ بچشمِ مجنوں

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مولانا کی کتاب "شعر العجم" پر ایک شاندار ریویو لکھا ہے۔ اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد مولوی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"آپ نے "شعر العجم" کی وہ مدح سنجی کی کہ میں نے خود اس پر دوبارہ اس لحاظ سے نظر ڈالی کہ یہ خط و خال اس میں ہیں بھی یا چشمِ مجنوں کی قوّتِ اختراع ہے۔"

ایک پُر لطف استفسار!

سیّد سلیمان ندوی مولانا کے مکاتیب جمع کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا شروانی صاحب سے دریافت کرتے ہیں:۔

"سیّد سلیمان میرے خطوط جمع کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس میرے کچھ ہفوات غلطی سے محفوظ ہوں گے؟۔"

"بارود نے ہمارا گھر دیکھ پایا ہے"

مولوی محمد اسحاق کی نواسی کی بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر موت کی خبر سن کر ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"الٰہ آباد کی ایک متوحش خبر سنی! معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے یعنی

بندوق کے صدمے سے اسحاق کی نواسی کا انتقال ہوگیا۔ بارود نے ہمارا گھر دیکھ پایا ہے (واضح رہے کہ بندوق ہی کے صدمے سے مولانا کا پانو بھی کاٹا گیا تھا)

پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کے باہمی تعلقات

علی گڑھ کالج میں پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی ایسے گھُل مل گئے تھے کہ اجنبیت اور بے گانگی بلکل دور ہوگئی تھی۔ پروفیسر ممدوح روزانہ اُن کو فرنچ پڑھانے ان کی اقامت گاہ پر آیا کرتے تھے اور وہ خود مولانا سے عربی پڑھتے تھے۔ مولانا اس زمانے کا جب وہ آرنلڈ صاحب سے فرنچ پڑھا کرتے تھے ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ

"آرنلڈ صاحب ہر روز صبح کے چھ بجے میرے پاس مکان پر مجھے سبق پڑھانے کو تشریف لاتے تھے۔

ایک دن چھ پر صرف ۵ منٹ زیادہ گزر گئے اور میں دیکھتا ہوں کہ مسٹر آرنلڈ صاحب سرپٹ بھاگے چلے آرہے ہیں۔ مکان پر پہنچتے ہی میرے سامنے عاجزانہ کھڑے ہوکر فرمانے لگے کہ "مولوی صاحب! ہم آپ کا مجرم ہے، ہم نے آج دیر کی، آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں"!

ایک یورپین فاضل ادب پر مولانا شبلی کا اظہار تعجب اور پروفیسر آرنلڈ کا جواب

مولانا جس زمانے میں علی گڑھ کالج کے پروفیسر تھے۔ فرماتے تھے کہ

"ایک دفعہ کوئی یورپین فاضل علی گڑھ آکر مجھ سے ملا۔ اس کو فارسی ادب کا ذوق تھا۔ اس سے اس موضوع پر باتیں ہوئیں، تو اس کی واقفیت بہت محدود معلوم ہوئی۔ دو سال کے بعد اس نے فارسی ادب پر ایک کتاب لکھ کر میرے پاس بھیجی جو بہت غنیمت تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے اس تعجب کا ذکر پروفیسر آرنلڈ سے کیا۔ اُنھوں نے پوچھا آپ ان سے کب ملے تھے؟ میں نے کہا دو سال ہوئے۔ جواب دیا: مولانا! یورپ کا آدمی دو سال میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔"

مولانا شروانی کی آمد کی خبر پر اظہارِ مسرت

۱۹۱۴ء میں جب مولانا سخت علیل ہوئے تو اپنے دوست مولانا شروانی کو ملاقات کے لئے اعظم گڑھ آنے کو لکھا۔ مولانا شروانی نے آنے کا وعدہ کیا تو خوشی سے اُچھل پڑے اور ان کو لکھا:-

"کیا واقعی آپ یہاں جلوہ فرما ہوں گے اور کیا درحقیقت

ع میرے ویرانے میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی ۔ نامۂ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں ع

سچ سچ بتا یہ حرف انہی کے قلم کے ہیں۔"

"حیات جاوید" لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب ہے"

سرسیّد کی لائف "حیاتِ جاوید" (مرتّبہ مولانا حالی) کی نسبت ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"حیات جاوید کو میں لائف نہیں سمجھتا، بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل ۶ وللنّاس فیما یعشقون مذاہب ۱؎"

۱؎ اور لوگ اپنی اپنی پسند کے متعلق مختلف الرّائے واقع ہوتے ہیں۔

"حیاتِ جاوید"، مُدلّل مدّاحی ہے!

ایک اور دوسری جگہ "حیاتِ جاوید" سرسیّد کی لائف کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں حیاتِ جاوید کو محض مُدلّل مدّاحی سمجھتا ہوں۔"

"شعر العجم اور سخندانِ پارس میں تباین!

ایک جگہ مولانا محمّد حسین آزاد کی کتاب سخندانِ پارس حصّہ دوم اور اپنی کتاب شعر العجم میں کس خوبی سے تباین ظاہر کیا ہے:۔

"آزاد کا سخندانِ پارس حصّہ دوم نکلا سبحان اللہ! لیکن الحمدللہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

نوٹ:۔ مولانا کو ڈر تھا کہ سخندانِ پارس اور شعر العجم میں تصادم نہ ہو لیکن

مولوی محمد حسین صاحب آزاد، نظم کی طرف نہیں آئے۔ اور اس کو سخندانِ پارس سے الگ تذکرۃ الشعراء کے نام سے لکھتے ہیں۔

شعر العجم پر ریویو کا شکریہ

مولانا شروانی نے مولانا کی کتاب شعر العجم پر ریویو لکھا ہے اس سلسلے میں کس خوبی سے ان کی اس تکلیف کا شکریہ ادا کرتے ہیں:۔

"شعر العجم کا یہ کیا کم احسان ہے کہ اس کی بدولت آپ کی ادبی بارشِ فیض پھر نصیب ہوئی۔ افسوس یہ دست و قلم زمینداری کے بدمزہ کاغذات پر صرف ہوں!۔"

یورپین عربی پروفیسر ابھی کوسوں ہم سے دور ہیں

نکلسن، جو ایک انگریزی پروفیسر ہیں۔ اس نے عرب کی ایک ادبی تاریخ (لٹریری ہسٹری آف عربیا) لکھی تھی۔ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"نکلسن سے مجھ کو پہلے سے واقفیت ہے۔ عربی میں یہ لوگ ابھی ہم سے کوسوں دور ہیں!"

"مُشیرِ خدا!"

سنہ ۱۹۰۲ء میں بمبئی میں پیر ابراہیم سیف الدین بغدادی سجادہ نشین شیخ عبد القادر جیلانی کا نہایت پُرشان استقبال اہلِ شہر نے کیا تھا اور بڑی شان و شوکت سے اہالیانِ بمبئی نے ان کا جلوس نکالا تھا۔ مولانا اس وقت

یہیں تھے۔ اس کے متعلق منشی محمد امین صاحب (مہتمم صیغۂ تاریخ بھوپال) کو لکھتے ہیں:۔

"آج کل یہاں پیر صاحب بغدادی کا بڑا ہنگامہ ہے۔ ان کی روشنی اور جلوس پر ۷۵ ہزار روپیہ ایک شب میں خرچ ہوا۔ گو وہ یہاں کے خدا ہیں، لیکن مجھ سے پورے ایک گھنٹے تک خلوت رہی۔ اتنی دیر تک انھوں نے کسی کو آنے نہ دیا، ورنہ روزانہ صبح سے شام تک ہزاروں کا مجمع رہتا ہے۔ میں نے مفید مشورے دیئے اور انھوں نے قبول کئے۔"

سیرت النبیؐ اور مولویوں کی ریشہ دوانیاں!

"سیرت النبی" کی تالیف کے سلسلے میں نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال نے دو برس کے لئے دو سو روپے ماہانہ امداد منظور فرمائی تھی اور اس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام کی تحریک تھی کہ "سیرت" خوش نما ٹائپ میں چھپے۔ مولانا نے نمونے کے طور پر چھپنے کے لئے اس کے مقدّمے کو ان کے پاس الہلال پریس کلکتہ میں بھیج دیا۔ مولانا ابوالکلام نے اس مقدّمے کو الہلال میں چھاپ دیا تاکہ اہلِ نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے۔ لیکن بعض مخالفین جن کو دل سے یہ بات پسند نہ تھی کہ سرکار عالیہ کی سرپرستی میں جو سیرت نبوی لکھی جائے، وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، اس کے منتظر تھے کہ سیرت کا کوئی صفحہ منظرِ عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کر دیں۔ یہ مقدّمہ نکلا تو مولوی عبدالشکور صاحب

ایڈیٹر "النجم" نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مقدّمے پر نہایت سخت تنقید لکھی مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی تھے، اس تنقید کو دستاویز بنا لیا، اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا اور بعض ذرائع سے وہ سرکارِ عالیہ تک پہنچائی گئی۔ اُنھوں نے مولانا سے حقیقتِ حال دریافت فرمائی اور اس کے جواب لکھنے کی فرمائش کی بلکہ خود مولانا کو بھوپال آنے کا اشارہ فرمایا۔ مولانا نے منشی محمد امین صاحب کو لکھا کہ "نہایت مہمل اور معاندانہ اعتراضات ہیں"۔ جواب کے متعلّق لکھا کہ "وہ لکھ دیا جائے گا، لیکن میرے نام سے نہیں چھپے گا۔ غرض اظہارِ حقیقت ہے نہ اظہارِ نام"۔ آخر میں لکھا کہ "میں بارش سے قبل نہیں آسکتا، بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لئے آجاؤں، لیکن اگر اسی درجے کے لوگوں کے لکھنے پر میری دار و گیر ہوتی رہے گی، تو میں سمجھتا ہوں کہ اعانت سے مستعفی ہو جاؤں"۔ سرکاری مراسلے کے جواب میں لکھا کہ "سرکارِ عالیہ کسی مستند عالم کو تجویز فرمائیں" تاکہ مسودہ اس کے پاس بھیج دیا جائے"۔ اور اپنی طرف سے شیخ الہند مولانا محمد حسن صاحب دیوبندی کا نام اس کام کے لئے تجویز فرمایا، لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطّلاع مل چکی تھی۔ لہٰذا ان لوگوں نے مولوی محمد حسن صاحب کو مسودے دیکھنے سے باز رکھا۔ اس سلسلے میں نبّاضِ وقت نے مولویوں کی ریشہ دوانیوں کی کس صفائی سے قلعی کھول کر رکھ دی ہے:۔

"بہر حال اب غور کرنا چاہیئے کہ کیا کیا جائے۔ چونکہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے، اس لئے سر دست اور کوئی مولوی بھی مسودہ دیکھنے کی ذمّہ داری اپنے سر نہ لے گا، ورنہ سمجھے گا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا"۔

یورپین قوم کی خوش اخلاقی

علی گڑھ سے پروفیسر آرنلڈ کے رخصت ہوتے وقت کالج میں ایک الوداعی جلسہ ہوا تھا، جس میں مولانا شبلی نے ان کے متعلق اپنی الوداعی تقریر میں کہا تھا:

"یہ یورپ کی تلوار نہیں، جس نے دنیا کی تمام قوموں کو مغلوب اور حلقہ بگوش کر لیا ہے، بلکہ یورپین قوم کی خوش اخلاقی ہے، جس نے تمام دلوں کو تسخیر کر لیا ہے۔"

مولانا آزاد کو اخبار کے نام کے متعلق مشورہ

مولانا ابوالکلام آزاد کلکتے سے کوئی اخبار نکالنا چاہتے تھے، اور اخبار کا نام ملک و ملت یا دفت رکھنا چاہتے تھے اس باب میں مولانا سے مشورہ طلب کیا تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"اخبار کا نام نہ ملک و ملت موزوں ہے نہ وقت۔ ایک مطول اور ایک زائد از ضرورت مختصر ہے۔ صرف آزاد نام ہونا چاہئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لوگ توافق اسمی کی وجہ سے خود نمائی کا شبہہ کریں۔"

مولویت کی صورت میں نہایت زیادہ کارآمد ہے

مولانا شبلی کا جن نوجوانوں کی ذہنی تشکیل میں ہاتھ تھا، ان میں سب

سے ذہین اور اُلوالعزم ابوالکلام آزاد تھے۔ چنانچہ مولانا نے ان کی ذہنی اور علمی تربیت میں بے انتہا کوشش کی۔ مولانا ابوالکلام کو غزل گوئی کا شوق تھا، اور شروع میں بکثرت سے کلکتے کے مشاعروں میں غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ مولانا کلکتے سے واپس آکر اُنھیں لکھتے ہیں:۔

"آپ کی سخن سرائی پر بار بار ٹوکنے کو جی چاہتا تھا کہ مرض میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن اس قدر گستاخی نہ ہو سکی۔ آپ کو اب زیادہ مولویت کی صورت میں رہنا چاہیئے۔ اس سے اچھے اچھے کام لے سکتے ہیں۔"

مکتوبِ بے کاتب!

مولوی عبداللہ صاحب بلوچی بی اے نے مولانا کو ایک بہت طویل خط لکھا ہے، مگر لطف یہ کہ اس میں اپنا نام ہی لکھنا بھول گئے ہیں۔ ان کو لکھتے ہیں:۔

"افسوس آپ نے اپنے لمبے خط میں اپنا نام بھی نہ لکھا۔"

ہدیتہً کتابوں کی طلبی پر اظہارِ خیال

مہتمم دارالاخبار انجمن اسلامیہ مظفر نگر نے مولانا سے ان کی تصانیف انجمن کے لئے ہدیتہً مانگی ہیں۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میری تصانیف میں صرف علم الکلام، موازنہ اور سوانح عمری

میرے پاس ہیں، وہ آپ کے پاس پہنچ جائیں گی۔ لیکن۔ یہ اصول فی نفسہٖ صحیح نہیں اس لئے کہ مصنف تو ایک ذات واحد ہوتا ہے اور انجمنیں ملک میں سیکڑوں ہیں اگر سب اس اصول پر عمل کریں، تو مصنف کے پاس کیا رہے گا۔ چونکہ میری معاش کتابوں پر نہیں ہے۔ اس لئے تعمیلِ ارشاد کرتا ہوں۔"

"بڑھاپے میں کیا اذان دوں"!

قاضی تلمّذ حسین صاحب ایم اے دارالعلوم ندوے میں آ گئے تھے۔ وہ ذرا اونچا سنتے تھے۔ ان کو متوجہ کرنے کے لئے مولانا کو بار بار صدائے صور کی ضرورت پیش آتی تھی، جو بڑھاپے میں ان کے لئے ایک وبال تھا۔ اس کے متعلق ایم مہدی حسن صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"قاضی صاحب ہمارے کام کے آدمی نکلے۔ نیچا سنتے تو خوش صحبت بھی تھے، جوان ہوتا، تو ان سے باتیں کرتا۔ بڑھاپے میں کیا اذان دوں۔"

ایم مہدی حسن کو طرزِ نگارش کی داد

ایک جگہ ایم مہدی حسن کی طرزِ نگارش کی کیا دل کھول کر داد دیتے ہیں:۔

"کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے۔

"دائرۃ المعارف" کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو، یقین کرنے کی بات نہیں۔"

ایم مہدی حسن کی "پیارے جناب" کی ترکیب اور مولانا شبلی کا ٹوکنا

ایم مہدی حسن نے کہیں ایک بار اپنے خط میں مولانا کو "پیارے جناب" لکھ دیا تھا۔ اتنے بڑے ماہر ادب سے اتنی عظیم الشّان غلطی بڑے تعجّب کی بات تھی۔ کس لطیف پیرائے میں ٹوکتے ہیں:۔

"جناب" اور "پیارے" کی خوش ترکیبی کی داد قبول فرمائیے۔"

دو رُوح اور ایک قالب

البشیر میں "قاموس الاسلام" کے عنوان سے ایم مہدی حسن کا ایک مضمون نکلا تھا۔ جب وہ مولانا کے ملاحظے سے گزرا تو اُس سے بے حد متاثّر ہوئے اور جوشِ مسرّت میں آکر مصنّفِ مضمون کو لکھا:۔

"البشیر" میں "قاموس الاسلام" کے نام سے ایک مضمون دیکھا نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں، یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا رہا اور احباب کو دکھاتا رہا۔"

مرزا دبیر کے ایک شعر پر مولانا شبلی کی گہری طنز

"موازنہ" میں ایک جگہ مرزا دبیر کے ایک بند کے مندرجۂ ذیل ٹیپ کے شعر کی کیا دھجّیاں اُڑائی ہیں اور مصنّف پر کیسی گہری طنز اور بلیغ تعریض کی ہے:۔

شہرہ ہے یہ تا بہ سرحدِ جنّ و ملک سے
مضمون مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

"شہرہ بھی انتہا کا ہے اور مضمون کو گھر پوچھنے کی بھی ضرورت ہے۔ شاید یہ مراد ہو کہ صرف نام مشہور ہو چکا ہے، لیکن چونکہ مضامین کو کبھی مرزا صاحب سے روشناسی نہیں ہوئی اور آستانۂ مبارک تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی، اس لئے گھر کا پتہ پوچھنا پڑا۔"

تعلیمی اصلاح

مسلمانوں کی جگ ہنسائی کا کھٹکا!

سنہ ۱۹۰۲ء میں جب مولانا نمازِ جمعہ کی تعطیل کا مسئلہ گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنے والے تھے، تو اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"تعطیل کی کوشش تو ہو رہی ہے، مگر ڈر یہ لگتا ہے کہ کہیں تعطیل ہو جائے اور مسلمان نماز پڑھنے نہ جائیں، تو ان کی کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔"

بدعات سے نفرت!

بدعات سے مولانا کو ہمیشہ سے سخت نفرت تھی۔ بدعاتِ شعبان و محرم کا ان کے ہاں پتہ بھی نہ تھا۔ اس طرح بزرگوں کے مزارات پر جا کر عوام جن بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ ان کو شرک سمجھتے تھے۔ ایک بار ایک صوفی ان سے ملنے آئے۔ سلسلۂ کلام میں مولانا نے فرمایا کہ اجمیر وغیرہ

کے بُت کدوں کو جلا دینا چاہیے۔ اس وقت تو وہ صاحب خاموش رہے، لیکن وہاں سے اُٹھ کر آئے تو مولوی عبدالسلام صاحب سے فرمایا کہ ان حضرت کو مراق تو نہیں ہوگیا ہے۔ اگر ان کا یہ خیال تھا تو کم از کم میرے سامنے اس طرح نہیں کہنا چاہیئے تھا۔

مُقلّد استاد اور غیر مُقلّد شاگرد!

دارالعلوم کی پرانی عمارت کے صحن میں ایک مسقّف حوض تھا۔ سیّد سلیمان مرحوم نے ایک دفعہ حوض کے پائپ سے وضو کیا اور اس کی چھت پر نماز پڑھنے لگے ۔ ساتھ ہی میلانِ خاطر کی بنا پر اتفاقاً رفع یدین بھی کیا۔ سیّد صاحب نے مولانا کو نہیں دیکھا، اور مولانا حفیظ اللہ صاحب کے چھپّر کے نیچے بیٹھے ہوئے ان کو دیکھ رہے تھے۔ نماز پڑھ چکے تو پاس بلایا اور فرمایا۔

میری عجیب قسمت ہے میں تو پکّا حنفی ہوں اور جو مجھ سے پڑھتا ہے، وہ اہلِ حدیث ہوجاتا ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی ۔ دارالعلوم ندوے کے نصاب کے ناظم تھے۔ اُنھوں نے ایک مرتبہ مولانا کو ندوے کے نصاب جاریہ کا ایک نقشہ بھیجا ہے۔ اس نصاب میں چند قدیم کتابیں ہیں۔ مولانا اس کو ندوے کے شایانِ شان نہ سمجھ کر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے لطیف پیرائے

میں اختلاف کا اظہار کرتے ہیں:۔

" مکرمی! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ کیا ندوے کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے! میں پوچھتا ہوں کہ جب ندوہ بھی دیوبند رہے، تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جا رہا ہے "

مولانا شبلی کو ندوے سے الگ کرنے کے لئے فردِ جرم

مولانائے محترم کو ندوے سے الگ کرنے کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں:۔

" آج کل سخت نرغہ ہے، سہارنپوری، شاہ جہاں پوری، پھلواروی، کاکوروی سب یکجا ہیں۔ رپورٹیں تیار ہو رہی ہیں فردِ جرم بہت بڑھی ہے، خرد برد کا بھی الزام ہے، بھاول پور کے عطیے کا اشتہار بھی شامل ہے، گورنمنٹ سے ایڈ کے متعلق خط کتابت اکبر الجرائم قرار دی گئی ہے، اور سب پر مستزاد الحاد اور زندقہ۔ جن عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا۔ ان میں کراماتِ اولیاء حق، حالاں کہ میں تو کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں ان ہی جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے:۔

میں اس میدان کا مرد نہیں!

بمبئی میں ندوے کے چندے کی فراہمی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

"ندوے کے لئے یہاں مولویوں کا جادو درکار ہے۔ کسی مشہور واعظ کو بلوانا پڑے گا۔ میں اس میدان کا مرد نہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے"۔

انسان عیسائی ہو سکتا ہے مگر غیر مقلّد نہیں ہو سکتا

مولانا شبلی جب تعلیم سے فارغ ہوئے۔ تو اس زمانے میں اہلِ حدیث کا فرقہ نیا نیا شروع ہوا تھا، اور ان کی مخالفت اور موافقت میں ایک ہنگامہ برپا تھا شبلی کے استاد مولانا محمد فاروقی ایک خالص حنفی تھے۔ شبلی بھی غیر مقلدوں کے سخت مخالف ہو گئے۔ بلکہ حنفیت کے جوش میں آکر اپنا لقب ہی نعمانی اختیار کر لیا۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:-

"انسان عیسائی ہو سکتا ہے، لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا"۔

ہوائی تیر!

مولانا شبلی کی زندگی میں ایک مرتبہ سید سلیمان نے دارالعلوم ندوے کی باہمی کشاکش کے سلسلے میں اپنے استاد کی حمایت میں قلم اٹھایا تھا اور مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری سے جنھیں شبلی سے بوجوہ مخالفت تھی، ایک اخبار میں

بعض ایسے سوالات کیے تھے، جن کی تہہ میں الزامات اور اعتراضات تھے، لیکن یہ الزامات و اعتراضات سب بے بنیاد تھے۔ اس پر مولانا شبلی نے سید سلیمان کو ٹوکا اور ایک خط میں انھیں لکھا:۔

"تم نے "وکیل" میں جو سوالات ناظم (مولانا خلیل الرحمن سہارنپوری) سے کیے ہیں، اس کے اکثر تیر ہوائی ہیں۔"

ندوے کی بہبودی کا خیال

مولانا شبلی جب بوجوہ ندوے سے مستعفی ہوئے اور طلبہ نے ان کی موافقت میں اسٹرائک کا عام اعلان کیا اور مولوی مسعود علی نے ہڑتالی طلبہ کو لے کر الگ مدرسہ قائم کرنا چاہا تو مولانا نے انھیں لکھا:۔

"تم نے مدرسہ الگ کر لیا اور فرض کر و چند روز چلا بھی سکے، تو بحث یہ ہے کہ کب تک؟ اور اس سے ان کو کیا تنبہ ہوگا۔ وہ دیوبند وغیرہ سے لونڈے بلوالیں گے۔"

بے نمازی دین دار!

سنہ ۱۹۰۱۳ء میں ایک صاحب نے ایک زمانے میں جب بعض علماء نے سرکار بھوپال میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ "سیرت" کی امداد بند کر دی جائے، مولانا کو ازراہِ ہمدردی لکھا تھا کہ "سیرت" کی تصنیف میں روحانیت سے قطع نظر نہ ہو۔ مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تراشے ہیں - ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے، لیکن دین دار نہیں، لیکن ان ہی دین داروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نمازِ فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی باوجود اس کے ان کی دین داری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا"

مسلمان، قوم کے نام سے نہیں، اسلام کے نام سے جاگتا ہے!

سنہ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں ندوے کا وہ عظیم الشان اجلاس ہوا، جس کو معنوی حیثیت سے ندوۃ العلماء کا سب سے کام یاب اجلاس کہا جاسکتا ہے، اس اجلاس میں مولانا نے بھی بڑی موثر اور زہرہ گداز تقریر کی تھی - دورانِ تقریر میں فرمایا تھا:-

"مسلمانوں کو قوم کے نام سے اٹھانے کی کوشش تیس برس سے جاری ہے، مگر اس کی ناکامی ظاہر ہے، کیوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت، قوم کے نام سے نہیں اسلام کے نام سے جاگتی ہے - اس نام سے پکارو، پھر دیکھو کہ اس کی بیداری کا کیا عالم ہوتا ہے"

کوئی کام دنیا میں بغیر شور و غل کے نہیں چلتا

مولانا جب حیدرآباد گئے اور وہاں سے واپسی پر ندوے کے کاموں میں اتنے منہمک رہے کہ وہ اپنے نیشنل اسکول کو جس سے انھیں بڑی محبت تھی، بھول گئے۔ اتنے عرصے میں اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ وہ تنزل کر کے مڈل اسکول ہو گیا۔ آخر جب مولانا ندوے کے ہنگاموں سے الگ ہوئے تو پھر اگلی محبت یاد آئی اور اس کی ترقی کے سلسلے میں مولوی اسحاق مرحوم کو لکھا:۔

"اعظم گڑھ میں پہلے ایک پرزور تعلیمی کانفرنس ہو" مولوی اسحاق مرحوم نے کچھ اختلاف کیا، تو انھیں لکھا:۔

"شور و غل فی نفسہ بیہودہ چیز ہے، لیکن اس کو کیا جائے کہ کوئی کام دنیا میں بے اس کے نہیں چلتا۔ انبیاء اور ریفارمرز دونوں کی نظیریں دیکھ لو۔ علی گڑھ کالج صرف شور و غل سے قائم ہوا اور اب تک اسی پر قائم ہے۔"

یہ میلی چمڑی بھی ایک روز درفش کاویانی بنے گی

اپنے منجھلے بھائی مسٹر محمد اسحاق صاحب بی اے ال ال بی کو ایک خط لکھا ہے، جس میں نیشنل اسکول اعظم گڈھ کے قائم رکھنے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ اسکول ہم لوگوں کے خیالات اور حوصلوں کا ایک عمدہ مشغلہ ہے۔

ہم اپنی زندگی کی عملی ترقی کے ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جائیں گے، ہم میں جو لوگ قومی مذاق پیدا کرتے جائیں گے، ان کے لئے اپنی قومی فیاضی کے صرف کرنے کا اس اسکول سے عمدہ تر کیا موقع ہو گا؟ سردست میرے نزدیک بھی، وہ ایک حقیر صورت رکھتا ہے لیکن ایک لوہار کی اس میلی چمڑی سے کم حیثیت نہیں ہے، جس کو اس نے مدت تک اپنے پاؤں کے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا تھا اور جو آخر کو ایک معمولی علم پر چڑھ کر تین ہزار برس آج تک درفشِ کاویانی کے فخر آمیز لقب سے پکاری گئی ۔"

سے درفش کاویانی۔ فریدوں کا جھنڈا۔ ضحاک کے برخلاف جو بغاوت ہوئی، اس میں اصفہان کا ایک لوہار جس کا نام کاوہ تھا، سرگروہ تھا۔ اس بغاوت میں اس نے اپنی دھونکنی کا جھنڈا بنوایا تھا۔ اس نے ضحاک کو قتل کر کے فریدوں کو بادشاہ بنایا جب فریدوں بادشاہ ہوا تو اُسے مبارک سمجھ کر اس پر ریشم چڑھا کر خاندان کیانی کا جھنڈا بنایا۔ کہتے ہیں جس لڑائی میں یہ جھنڈا جاتا تھا۔ ایرانیوں کی فتح ہوتی تھی۔

پھیکی کانفرنس

۱۸۹۲ء میں دہلی میں ایک کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس کے متعلق مسٹر محمد اسحاق کو لکھتے ہیں:۔

"کانفرنس اب کی غالباً پھیکی ہو گی۔ مولوی حشمت اللہ اور مرزا حیرت کی بڑ بہت سن چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں

ہی، مولوی نذیر احمد بھی غالباً چپ رہیں اور بولیں بھی تو ان کا
طرز اجیرن ہو چکا۔"

علی گڑھ کالج کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہی

علی گڑھ کالج میں تفرّری کے بعد ایک جگہ وہاں کے طلبہ کے متعلّق اظہار خیال
کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" یہاں میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے ۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں
فرقہ، نہایت مہمل فرقہ ہے ، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت،
سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں ۔ یہاں ان
چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا ۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ
ہی۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھکو بی اے کی نسبت یہ خیال
دلانے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے ۔
لاحول ولا ، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔"

منصفی کا غرور، فرعون کے غرور سے بڑھا ہوا ہی

علی گڑھ کالج کے یونین کلب میں متعدّد جلسوں کی خبر دیتے ہوئے
ایک جگہ مولوی محمد سمیع صاحب کو لکھتے ہیں :-

" یہاں ان دنوں خوب جلسے ہو گئے ۔ بیرسٹروں کے لئے خیر مقدم ہوئے
آنریبل نوّاب عبد المجید جون پوری بھی تھے ۔ مجھ سے بہت انس کیا ۔ اصرار کرتے

گئے کہ الہ آباد میں ان کے ہاں ٹھہروں، اور ان کو پہلے سے مطلع کر دوں۔ کل مولوی عبدالغفور، شاہ امجد اللہ بھی یہاں پہنچے۔ امجد اللہ کی خر دماغی پر سخت حیرت ہوئی ان سبھوں کو منصفی اس سے زیادہ مغرور کرتی ہے، جتنا کہ فرعون کو مصر۔"

ندوے کے نصاب پر تنقید

ایک جگہ ندوے کے نصاب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"حقیقت یہ ہے کہ ندوے کی حالت دیکھ کر ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اس دفعہ بھی "شرح عقائد نسفی"، "ہدیۂ سعیدیہ"، "نور الانوار" درس میں تجویز کی گئی ہیں، اور مولوی حفیظ اللہ نے کیا ہے، بے چارے نے ان کتابوں کے سوا اور نام بھی تو نہیں سنے ہیں۔"

ندوے میں مراجعت سے انکار کا سبب

ایک جگہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی کو ندوے میں اپنی مراجعت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

"مجھ کو اب ندوے سے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے نقارچی کا کام لینا مقصود ہے، تو اور بھی بہت لوگ ہیں۔"

رسالہ "الندوہ" کے لئے میں طبل نوازی کا کام انجام نہیں دے سکتا

اسی سلسلے میں ممدوح کو دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"رسالے میں مجھ کو دخل نہیں۔ تو کیا مجھ سے دعا گوئی اور طبل نوازی کا کام لینا مقصود ہے؟ اس جنّت سے تو دوزخ بھلی، اس مردی سے نامردی بہتر ہے۔"

نوٹ :۔ رسالہ "الندّوہ" جس کا ندوے کی طرف سے نکالنا زیر تجویز تھا۔

ندوے پر طنز!

ایک جگہ ندوے پر کس خوبی سے طنز کی ہے :۔

"مسلمان سود بے تکلّف دیتے ہیں، لیکن لیتے نہیں۔ حرام دونوں ہیں، لیکن پہلی صورت میں چونکہ نقصان ہے، اس لئے اس کے مرتکب، اور دوسری صورت میں چونکہ فائدہ ہے، اس لئے اس سے مجتنب ہیں۔ بعینہٖ یہی حالت ندوے کی ہے۔"

ناپاک و نجس کورس

ایک خط میں مولانا شروانی کو ندوے کے نصاب سے اپنی بیزاری کی اطّلاع یوں دیتے ہیں :۔

"آپ کی اس تحریر سے کہ آپ غزل گوئی کی تاریخ لکھ رہے ہیں، نہایت خوشی اور انبساط ہوا۔ لیکن اس خط میں وہ ناپاک اور نجس کورس بھی تھا، جو ندوے میں جاری ہے۔"

خدا کے سامنے جواب دہی کا خوف

ایک جگہ مولانا شروانی کو ندوے کے سلسلے میں لکھتے ہیں :- "خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ تمام وعدوں کا خدا کے ہاں ہم اور آپ کیا جواب دیں گے۔"

ندوے میں مہابھارت

ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں چند ضروری امور کے طے کرنے کے سلسلے میں ایک جلسۂ انتظامیہ ہونے والا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں :-

"جلسۂ انتظامیہ ہوگا، تو بجائے ضروری امور کے لوگ نظامت کے لئے کمریں باندھ کر آئیں گے اور کل اجلاس میں مہابھارت رہے گا۔"

مُردہ بدستِ زندہ

مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ندوے میں قدیم نصاب مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کو لکھتے ہیں :-

"سنا ہے کہ آپ ندوے کے نصاب کو پھر وہیں کھینچ کرلے جانا چاہتے ہیں، جہاں دو برس پہلے تھا۔ خیر "مُردہ بدستِ زندہ"، جو چاہے سو کیجئے۔"

اختلافِ علماء

ایک جگہ علمائے وقت کی باہمی خصومت اور آپس کے رشک و حسد کو کس خوب صورتی سے بیان فرمایا ہے :-

"وقف ڈیپوٹیشن کا قافلہ سالار کوئی عالم ہوتا، اور سب لوگ خوشی سے منظور کرتے! لیکن نہ کوئی اس قدر بااثر ہے نہ متفق علیہ عام ہے۔ کسی دنیا دار پر

تو علماء متّفق ہی ہو جائیں گے۔ لیکن خود اپنے ہی گروہ میں سے کسی پر متّفق ہونا مشکل ہے“۔

”ندوہ“ اور ”النّدوہ“

ایم مہدی حسن کے نام ایک خط لکھا ہے، اس میں ”ندوہ“ اور ”النّدوہ“ کی خستہ حالی اور اپنی پیرانہ سالی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”سخت افسوس ہے کہ ندوے کی بدولت النّدوہ اور النّدوہ کی بدولت ندوے کو نقصان پہنچتا ہے کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں، میں اب صرف ہمّت ہی ہمّت رہ گیا ہوں آپ دیکھیں گے تو ذرا دیر کے بعد پہچانیں گے۔“

مولویوں کی پالی

دارالعلوم ندوے میں ایک جلسۂ انتظامیہ ہوا تھا، جس میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری (جو پہلے رسماً نائب ناظم تھے، اور اب کسی ناظم کی عدم موجودگی میں اپنے کو قائم مقام ناظم سمجھتے تھے) بہ طور حریف کے مولانا کے مقابل کھڑے ہوئے اور تمام ممبروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کی معتمدی سے بھی مولانا کا عہدہ توڑ دیا جائے۔ اس سلسلے میں کیا گہری چٹکیاں لی ہیں:۔

” اب کی متعصب مولویوں سے پالی لڑنی پڑی۔ جلسۂ انتظامیہ میں نائب سکریٹری ندوے نے جو اپنے آپ کو سکریٹری کہتے اور لکھتے ہیں،

تجویز پیش کی کہ شبلی کو الگ کر دیا جائے۔ یعنی اس کا عہدہ ہی توڑ ڈالا جائے۔ یارانِ قدیم علی گڑھ نے طعنہ دیا کہ" اور مولویوں میں گھسو میں نے کہا میں نے یہ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا۔ بہر حال یہ لوگ نہ ہوتے تو ندوے کی حاجت ہی کیا تھی۔ یہ لوگ تو میرے دعوے کے لئے بیانِ تحریری ہیں۔"

علماء میں کتب بینی کے ذوق کا فقدان!

کتابوں کا مطالعہ اور نادر کتابوں کی تلاش مولانا کا فطری ذوق تھا۔ عمر خیام کی کتاب جبر و مقابلہ بڑی کوشش و تلاش کے بعد حاصل کی ہے۔ اس کے متعلق اپنے دوست ایم مہدی کو اطلاع دیتے ہوئے مولوی صاحبان کے کتابوں کے شوق اور ذوق کتب بینی کا کس خوبی سے مذاق اڑایا ہے:۔

خیام کا جبر و مقابلہ یورپ نے آج سے ۵۰ برس پہلے چھاپا تھا، ہم کو آج ملا، اور مولویوں کو شاید قیامت میں۔"

بوڑھے غمزے!

علی گڑھ میں ایک سالانہ نمائش ہوتی ہے جس میں ضلع کے اکثر رؤسا بڑے ساز و سامان سے شریک ہوتے ہیں، اُن کے خیمے ڈیرے لگتے ہیں۔ سرسید نے ان میں سے مسلمان رئیسوں کو کالج کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک قومی تھیٹر کی طرح ڈالی۔ لوگوں نے اس کو سنجیدگی کے خلاف

سمجھ کر اس کی مخالفت کی، مگر سرسیّد نے یہ کہہ کر کہ قوم کے لئے سب کچھ گوارا ہے، علی گڈھ کی نمائش گاہ میں چند خیمے کھڑے کر دیئے، اور ایک اسٹیج ترتیب دیا۔ اس میں سب سے پہلے حاجی اسماعیل خاں، جو عرب اور ٹرکی میں رہ چکے تھے، کپتان کی وردی میں آئے، ان کے ساتھ چند سپاہی تھے، ان سے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی میں باتیں کیں، پھر سرسیّد صاحب آئے اور کپتان سے گفتگو کر کے ایک دل پذیر لکچر دیا اور آخر میں حافظ کی ایک پوری غزل پڑھی۔ اس کے بعد چار انگریز پروفیسر آئے اور انھوں نے ساتھ ملکر انگریزی گیت گایا، پھر آغا کمال الدین سنجر طہرانی نے فارسی قصیدہ پڑھا۔ اس کے بعد آغا محمّد حسین نے، جو مشہور سیّاح تھے، بدوی شیخ کی صورت میں آ کر عربی گیت گایا، اس کے بعد خواجہ محمّد یوسف صاحب وکیل نے آ کر تقریر کی اور اپنی اردو مثنوی سنائی، پھر پروفیسر آرنلڈ نے آ کر ایک انگریزی نظم پڑھی۔ ان سب کے بعد مولانا شبلی صاحب سبز عبا پہنے اور رنگین عمامہ باندھے اسٹیج پر آئے اور اپنا ایک اردو قومی مسدّس پڑھا، جس کا ایک بند یہ ہے

کوئی کہتا ہے یہ تھیٹر تو نہیں ہی لیکن
ساز و نغمہ بھی نہ ہو ساتھ نہیں ہی ممکن
راتیں کاٹی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن
دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگان مسن
کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہوگی آخر
بوڑھے غمزوں میں کوئی بات تو ہوگی آخر

شگفتہ مزاجی، تفریحی مشاغل سے دلچسپی اور شوقِ سیاحت

ڈاکٹر اور بخار میں مقابلہ

علی گڈھ کی آب و ہوا مولانا کے مزاج کے موافق نہ تھی۔ خصوصاً سرسیدؒ کے جس بنگلے میں وہ رہنے لگے تھے، وہ نشیب میں تھا، اور وہاں پانی مرتا تھا، اس لئے وہ جگہ ملیریائی تھی اور مولانا کو ملیریا کی شکایت پیدا ہوگئی۔ اس سلسلے میں ایک خط میں مولوی سمیع صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں :-

"بخار کے دورے ہوجاتے ہیں۔ آج ڈاکٹر نے بڑے سروسامان سے بخار کو روکنے کے لئے تیاریاں کی ہیں، مگر دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے"۔

پاؤں کا حادثہ!

مولانا کو ۱۹۰۷ء میں پاؤں کا حادثہ پیش آیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کی صبح کو دس بجے وہ میز سے اٹھ کر ہال میں تشریف لے گئے۔ جو ان دنوں زنان خانے میں شامل تھا۔ اب اسی ہال میں دارالمصنّفین کا کتب خانہ ہے، یہاں تخت بچھا تھا، یہیں مولانا ایک پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گئے۔ اس بنگلے میں باغ بھی تھا جس میں پپیاں لگی تھیں اور کوّے آکر نقصان پہنچاتے تھے۔ مولانا کے اکلوتے صاحبزادے حامد صاحب نے ان کے اڑانے کے لئے بندوق میں چھرّوں کے کارتوس بھر رکھّے تھے اور اس کو ہال میں چھوڑ گئے تھے۔ مولانا نے اس بندوق کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوئی۔ پاس ہی مقابل میں ان کی بہو یعنی حامد صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں، ان کو یہ کہہ کر دی کہ "عورتوں سے تو اٹھ بھی نہیں سکتی"۔ اس لینے دینے میں ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر پڑ گیا اور بندوق سر ہو گئی۔ جس کا نشانہ مولانا کا پاؤں (قدم) تھا۔

اس وقت ایک عزیزہ نے آکر جب ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھّا، تو انھوں نے جوتے میں سے پاؤں نکالا، اس وقت پاؤں کی ایڑی جوتے ہی میں پھنس کر رہ گئی۔ چونکہ ہڈّیاں کچھ اوپر تک پھنس گئی تھیں، اس لئے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی۔ اس حادثے کی تفصیل کے سلسلے میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت

کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟ ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی۔ بہت چلا پھرا، دوڑا دھوپا، ملا جلا، آخر کہاں تک! خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہیے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بٹھا دیا۔"

"آپ نے مجھ کو پاؤں دیا تو خدا نے آپ کو سر دیا"

۱۹۰۸ء میں جب مشرقی یونی ورسٹی کے سلسلے میں مولانا حیدر آباد گئے، تو نواب افسر الملک بہادر نے ان کے لئے لکڑی کا ہلکا سا پاؤں بنوایا تھا، کارخانے سے اس کو لینے کے لئے مولانا اور نواب افسر الملک خود گئے۔ نواب صاحب پاؤں، ہاتھ میں لئے ہوئے گاڑی پر سوار ہوئے تو مولانا نے برجستہ کہا۔

"پا بدستِ دگرے، دست بدستِ دگرے"

حسن اتفاق سے اسی روز نواب صاحب کو "سر" کا خطاب ملا تھا۔ مولانا نے کہا کہ:

"آپ نے مجھ کو پاؤں دیا، تو خدا نے آپ کو سر دیا۔"

آمد نہیں آورد

۱۱ر مارچ ۱۹۰۸ء کو مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو ایک خط میں اپنے پاؤں بننے کی خبر دیتے ہیں تو لکھتے ہیں :۔

" پاؤں بن گیا۔ آمد تو نہیں، آورد ہے۔ رفتہ رفتہ شاید ترقی ہو "

" اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں "

میر اکبر حسین صاحب جج سے ان کے تعلقات علی گڈھ کے ابتدائی زمانے سے تھے۔ میر صاحب قافیوں کے استاد تھے۔ الہ آباد میں ایک دفعہ مولانا نے کہا کہ میر صاحب میں آپ کی تلاشِ قافیہ کا جب قائل ہوں گا، جب آپ میرے نام کا قافیہ باندھیں۔ میر صاحب نے ہنس کر فرمایا: " دیکھیے میں آپ کو بھی باندھتا ہوں " بات ہنسی میں ختم ہو گئی۔ ایک دو روز کے بعد میر صاحب نے ۲۳ر نومبر ۱۹۰۷ء کو دعوت کا ایک منظوم رقعہ ان کے پاس بھیجا جس میں لکھا تھا ؎

آتا نہیں مجھکو قبلا قبلی — ہر بات یہ صاف بھائی شبلی
مل جائے جو یہاں دال دلیا — سمجھو تم اُسے پلاؤ قلیا

مولانا نے اس کے جواب میں لکھا ؎

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال — لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں — حلقہ درگوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، منفور ہوں میں

مولانا روم کی پیشین گوئی

ایک دن فرمایا کہ بھائی میں استدلالی (متکلم) تھا۔ مولانا روم چھ سو برس پہلے کہہ گئے تھے کہ میرا پاؤں کٹے گا اور لکڑی کا پاؤں بنے گا۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

نقلی رفتار!

علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ چل رہے تھے، میں بھی ساتھ تھا۔ فرمانے لگے:۔

"میاں! پہلے گفتار و کردار نقلی تھا، اب رفتار بھی نقلی ہے۔"

عذرِ لنگ!

مولانا شروانی فرماتے ہیں: ایک بار علی گڈھ کالج میں لکچر دینے مقررہ وقت کے بعد تشریف لائے، تو عذرِ تاخیر بیان فرما کر کہا:۔

"یہ عذر، عذرِ لنگ نہ خیال فرمایا جائے"

حضرت ادریس علیہ السّلام سے ہمسری کا دعویٰ[1]

مولانا، لکھنؤ میں دار العلوم کے کوٹھے پر رہتے تھے۔ پاؤں کٹنے کے بعد جب کہ مولانا اعظم گڈھ میں تھے۔ ایک مرتبہ سید سلیمان ندوی نے ان سے لکھنؤ آنے کی خواہش کی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"میں لکھنؤ میں اگر کوٹھے پر چڑھوں تو حضرت ادریس[1] کی طرح پھر کبھی اترنا نصیب نہ ہوگا۔

[1] ادریسؑ ایک پیغمبر جو حضرت آدم کی اولاد سے ساتویں پشت میں تھے توریت کی رو سے ۳۵۰ برس کی عمر پائی اور زندہ چھٹے آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔

ہمارے ہی بزرگوں نے سر کٹوائے تھے میں پاؤں کٹوانے پر کیا روؤں!

پاؤں کے حادثے نے مولانا کو سخت جسمانی حادثے میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ تین مہینے تک بسترِ علالت پر رہے، لیکن شکایت کا ایک حرف بھی ان کی زبان سے نہ نکلا۔ واقعے کے کوئی تین ہفتے بعد مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

"تکلیف گو سخت ہے، لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے، جنھوں نے سر کٹوائے تھے، میں پاؤں کٹوانے پر کیا روؤں۔ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ"۔

فردوسی کی کرامت

مولانا جب موازنۂ انیس و دبیر سے فارغ ہو کر شعر العجم میں فردوسی کے شاہ نامے

پر تبصرہ لکھ رہے تھے، اس کو اتفاق کہیئے یا فالِ بد کہ اس تبصرے کو اس شعر پر ختم کیا تھا ؎

"

بریدو درید و شکست و بہ بست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

اور اس کے بعد ہی زنان خانے میں تشریف لے گئے کہ صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

" جب موازنہ سے بلکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو، ار مئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعے سے ذرا پہلے شاہ نامے کا یہ مصرع
" درید و برید و شکست و بہ بست " قلم کی زبان پر تھا۔"

ہرزہ گردی کی سزا

ایک جگہ حادثۂ پا کے متعلق مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔
" متصل ہرزہ گردی کی سزا دی گئی۔"

حادثۂ پا پر مولانا شبلی کی رباعیاں

حادثہ جو ہونا تھا، ہو گیا، مگر بقول مولانا شروانی " علمی آدمیوں کی ہر بات علمی ہوتی ہے۔" اس حادثے نے علم ادب کا ایک نیا پہلو سامنے کر دیا۔ مولانا حالیؒ مرحوم کی

نواب سید علی حسن خان مرحوم، خواجہ عزیز الدین مرحوم، اور تلامذہ میں مولوی اقبال احمد صاحب سہیلؔ، مولوی عبدالسلام صاحب، مولوی سید سلیمان مرحوم نے چند رباعیاں کہیں۔ جن میں اس واقعے کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہات کی گئیں۔ خود مولانا شبلی نے بھی اس حادثے پر کئی رباعیاں کہی تھیں۔ جن میں درج ذیل دو رباعیاں قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱)

ہر چند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے
آثارِ ہلاک سر بسر پیدا تھے
ممنون ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی
گو پاؤں کٹے، قدم بر جا تھے

(۲)

مقبول نہیں ہے بے نوائی میری
آلودۂ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی
ناقص ہے ابھی بے سر و پائی میری

عقدِ ثانی کی علتِ غائی

مولانا کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد مولانا نے عدمِ تاہل کا ارادہ کر لیا تھا، اور پانچ سال تک غیر متاہلانہ زندگی بسر بھی کی، لیکن سنہ ۱۹۰۱ء میں جب ایک جگہ جمعیت خاطر سے بیٹھنا چاہا، تو دوسری شادی بھی کی۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ ۵ برس کے تعطل کے بعد میں نے جو تعلق اختیار کیا وہ صرف اس لئے تھا کہ ایک زنجیر پاؤں میں پڑ جائے تاکہ مارا مارا نہ پھروں۔"

جب کتاب سے گھبراتا ہوں تو بچّے سے جی بہلاتا ہوں

مولانا کی دوسری بیوی سے جو لڑکا پیدا ہوا تھا، اس سے مولانا کو خاص دل بستگی تھی۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اس پیرانہ سالی میں خدا نے مجھ کو باپ بنایا۔ کتاب سے گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں"۔

انسان بغیر سفر کے انسان نہیں بن سکتا

شیخ حبیب اللہ کو قسطنطنیہ سے خط لکھا ہے۔ اس میں اس سفر کے تاثرات کی تفصیل اور "بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے" کی شرح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا، وہ ہزار کتابوں کے مطالعے سے نہیں ہو سکتا۔ مجھ کو معلوم ہوا کہ انسان جب تک دنیا کے بڑے بڑے حصّے نہ دیکھے، انسان نہیں ہو سکتا۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چاردیواری میں بسر ہوتی ہے"۔

مفصّل خط کے مفصّل جواب کی استدعا

مولانا کے ایک دوست جو مختصر نویسی کے عادی ہیں، ان سے اپنے مفصّل خط کا جواب طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جواب جلد دیجیے گا، مگر خدا کے لئے دہن یار کی طرح مختصر نہ ہو"۔

ڈاکٹری علاج محض فضول اور صرف شاعری ہے

حیدرآباد کی ملازمت کے درمیان میں مولانا کی علالت بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ جسم میں خون نہیں رہا ۔ بلکل سفید ہو گئے تھے ۔ حیدرآباد سے دولتآباد میں جو شملے کی طرح ایک صحت افزا مقام ہے منتقل ہو گئے ۔ یہاں آکر ایک ٹانگ میں درد پیدا ہو گیا ۔ جس سے سخت تکلیف تھی یاد مرار بہت بڑھ گیا تھا ۔ دن میں بارہ بارہ دفعہ پیشاب آتا تھا ۔ اور زیادہ مقدار میں آتا تھا ۔ مولانا کے منجھلے بھائی مسٹر محمدؐ اسحاق صاحب بی ۔ اے ۔ ال ال ۔ بی کو جب اطلاع ملی تو ڈاکٹر سے رجوع لانے کا مشورہ دیا انھیں جواب میں لکھتے ہیں :۔

" بھائی ! ڈاکٹر وغیرہ اور ان کا علاج محض فضول اور صرف شاعری ہے میں علاج تو ہرگز نہیں کروں گا ۔"

میں ان دنوں دیوالیہ ہوں !

ایک عزیز کو بیرنگ خط بھیجا ہے ۔ اس میں اپنی معذوری کس طرح سے بیان کی ہے ۔ " بیرنگ خط کا برا نہ ماننا ۔ میں ان دنوں دیوالیہ ہوں ۔"

حضرت عمرؓ کے بارے میں سُنّی اور حضرت امیرؓ کے بارے میں شیعہ

چودھری سید نظیر الحسن صاحب رضوی نے مولانا کی تصنیف " موازنہ انیس و دبیر " کا جواب لکھا ہے ۔ جس کا نام " المیزان " ہے ۔ موصوف حضرت امام حسنؓ کے حالات مبارک لکھ رہے تھے ۔ اس سلسلے میں مولانا ان کو لکھتے ہیں :۔

" آپ حضرت امام حسنؓ کے حالاتِ مبارک لکھ رہے ہیں ۔ بہتر اور باعثِ اجر ہے ، لیکن پہلے جنابِ امیرؓ کا درجہ تھا ۔ جنابِ امیرؓ کی عمدہ سوانح عمری کی سخت ضرورت ہے ۔ نہایت ناتمام کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ۔ اگر اہلِ سُنّت

ان کے بہت سے فضائل سے بے خبر ہیں۔ میں حضرت عمرؓ کے بارے میں سنی اور حضرت امیر کے بارے میں شیعہ ہوں۔"

کشتی اور دنگل دیکھنے کا شوق

مولانا، پہلوانوں کی کشتی اور دنگل دیکھنے کے بڑے شائق تھے۔ مولانا شروانی فرماتے تھے کہ میں نے ان کو سب سے پہلے علی گڑھ کی نمائش میں دنگل میں دیکھا۔ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم جو ساتھ تھے، بتایا کہ "یہی مولوی شبلی ہیں"۔ تو وہ فرماتے تھے کہ:-

"مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مولوی! اور دنگل!۔"

بمبئی سے روانگی پر تأسف

ایک بار عین اس وقت کہ مولانا چمن زار بمبئی کی گل گشت سے عالم طلسم میں پہنچے ہوئے تھے، بھاول پور کے عہدہ داروں کا خط ملا کہ وہ لوگ ریاست کے حکم سے ندوے کے معائنے کو آرہے ہیں۔ اس وقت وہاں مولانا کی موجودگی ضروری ہے۔ مولانا بادلِ ناخواستہ بمبئی سے عازمِ اعظم گڑھ ہوتے بوقت مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

"بالکل اسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شدّاد نے بہشتِ عدن کو خیر باد کہا تھا۔ خواجہ حافظ کے دربار سے رخصت ہوا۔ اب امیر خسرو سامنے ہیں۔"

قرض خواہوں اور چپراسیوں کے بچھو!

حیدر آباد کی ملازمت سے علاحدگی کے بعد اپنے فرزند حامد حسن صاحب نعمانی کو لکھتے ہیں:۔

"میں ایران جانے کی تیاری کر رہا ہوں گھر آتا، لیکن وہاں قرض خواہوں اور چپراسیوں کے بچھو لپٹ جائیں گے"۔

"اب میں اپنا سایہ رہ گیا ہوں!"

مولوی عبدالباری صاحب ندوی (سابق اسسٹنٹ پروفیسر دکن کالج پونہ) کو ایک خط لکھا ہے۔ ادائے مطلب کے اس بادشاہ نے اس خط کے ایک ہی جملے میں پیرانہ سالی کی شکایتوں کے دفتر کے دفتر پیش کر دیئے ہیں:۔

"ہاں بھائی! اب میں اپنا سایہ رہ گیا ہوں۔"

"تیل تمام ہو چکا!"

ایک اور جگہ مولوی عبدالباری صاحب ندوی کو لکھا ہے:۔

"بھائی! تیل تمام ہو چکا۔"

عیسائیوں کے گرجے میں عالمانہ لباس پہن کر جانا موزوں نہیں

مولانا نے اپنی کتاب الفاروق لکھنے کے سلسلے میں ممالکِ اسلامیہ

مصر وشام اور قسطنطنیہ وغیرہ کی بھی سیر کی۔ ان ممالک میں علماء کو عمامہ یا ٹرکی ٹوپی پر ایک سفید دھجی (جس کو عربی میں لفہ کہتے ہیں اور جو اہلِ علم کی خاص علامت خیال کی جاتی ہے) لپٹنا ضروری امر ہے۔ جب مولانا بیت المقدس پہنچے، اور جس دن وہاں قمامہ (یہ ایک نہایت وسیع گرجا ہے اور عیسائیوں کے اعتقاد کے موافق حضرت عیسٰی علیہ السلام اسی مقام میں مصلوب و مدفون ہوئے اور یہیں سے آسمان پر گئے) کی سیر کو گئے، تو سر پر صرف ٹوپی تھی، عمامہ نہ تھا، تو راستے میں عجیب لطیفہ پیش آیا۔ فرماتے تھے:۔

"میں جس دن قمامہ کی سیر کو گیا، میرے سر پر صرف ٹوپی تھی، عمامہ نہ تھا۔ راہ میں جا رہا تھا کہ ایک صاحب نے جو روشناس ہو گئے تھے، دیکھ لیا اور مفتی صاحب (بیت المقدس کے مشہور اور نامور عالم سیّد طاہر) کے جلسے میں اس کا تذکرہ کیا۔ چونکہ وہاں کی رسم کے موافق یہ بالکل نئی بات تھی) لوگوں میں اس کے چرچے ہوئے یہاں تک کہ دوسرے دن جب میں مفتی صاحب کے دربار میں گیا۔ تو ایک صاحب نے بڑے تعجّب اور حیرت سے پوچھا کہ سمعنا ان حضرۃ الشیخ خرج من غیر لفۃ یعنی ہم نے سنا کہ جناب والا عمامہ ولفّہ کے بغیر بازار میں نکلے۔ میں نے کہا ہاں، میں عیسائیوں کے گرجے میں گیا تھا اور ایسے مقامات کے لئے عالمانہ لباس موزوں نہیں ہے۔ سب بول اٹھے کہ واللہ قد اصبتم یعنی آپ نے بالکل بجا کیا ہے"

ترک سپاہیوں میں لکھنوانہ تکلّف

قسطنطنیہ میں راہ میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کا طریقہ بھی عجیب وغریب ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"پہلے سینے پر، پھر ہونٹوں پر، پھر پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہیں ان اعضا کا ہاتھ سے چھو لینا ضروری نہیں، صرف محاذات کافی ہے۔ اگرچہ اس طریقے پر سلام کرنے پر تین منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، لیکن مشّاقی کی وجہ سے تینوں مرحلے اس جلدی سے طے ہوتے ہیں کہ معمولی سلام سے زیادہ عرصہ نہیں لگتا۔"

مجلس میں سلام کرنے کا جو طریقہ ہے، وہ زیادہ تکلّف آمیز ہے، جو ترک جیسے بہادروں کے شایانِ شان نہیں۔ کس بلیغ انداز میں اس کا مضحکہ اڑایا گیا ہے :۔

"بیٹھ جانے کے بعد حاضرین میں سے ہر شخص کی طرف الگ الگ مخاطب ہو کر سلام کرنا پڑتا ہے، بالکل اسی طرح جیسا لکھنؤ میں دستور ہے۔ معلوم نہیں ترک جیسے سپاہیوں کو یہ لکھنؤانہ تکلّف کس نے سکھایا۔"

"میں مولوی آدمی ہوں مجھ کو گانے سے کیا واسطہ!"

قسطنطنیہ کی چند روزہ اقامت میں بہت سے لوگ مولانا کے یار و غم گسار بن گئے تھے، جو جلوت و خلوت میں ہم دم و ہم راز رہتے تھے۔ فواد بک جو

مکتب ملکیہ کے ایک ممتاز طالب علم تھے، جن سے مولانا کی ملاقات عزیزانہ تعلق کی حد تک پہنچ گئی تھی، ان کو گانا بھی آتا تھا، وہ مزے میں آکر مولانا کو عربی گیت سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن اصرار سے مولانا کو بھی تان سین کا پارٹ ادا کرنا پڑا۔ فرماتے ہیں:۔

"ایک دن مجھ سے بھی فرمائش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ۔ میں نے بہتیرا کہا کہ بھائی میں مولوی آدمی ہوں، مجھ کو گانے سے کیا واسطہ، لیکن وہ کب مانتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر میں نے اردو کے دو تین شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے، اور کہا کہ ہندی یوں ہی گاتے ہیں:"

اسکندریہ میں ایک قلی کی جسارت!

ہندوستان میں جس طرح جہاز کے لنگر انداز ہونے اور ریل کے اسٹیشن پر رکنے کے بعد ملّاح اور قلی مسافروں سے بچھو کی طرح لپٹ جاتے ہیں، یہی حال اور ممالک کا بھی ہے۔ چنانچہ ممالکِ اسلامیہ کی سیر کے سلسلے میں شہرِ اسکندریہ میں مولانا کو بھی اس آفت سے دوچار ہونا پڑا۔ فرماتے ہیں:۔

"اسکندریہ میں جہاز کا لنگر انداز ہونا تھا کہ قلیوں اور ملّاحوں کی مصیبت کا سامنا ہوا۔ بہ ہزار خرابی کنارے پر پہنچا۔ وہاں قلیوں کا ہجوم تھا اور ایک ایک مسافر پر چار چار گرے پڑتے تھے۔ ایک قلی نے زبردستی میرا اسباب اٹھایا۔ مجبوراً میں اس کے ساتھ ہو گیا، لیکن مجھ کو قاہرہ جانے کی جلدی تھی، اس لئے

میں نے اسی وقت گاڑی کرایہ کی اور اسٹیشن پہنچا، لطف یہ کہ قلی صاحب بھی گاڑی پر بیٹھ لئے۔ اور میرے پہلو میں بیٹھے۔ میری کیا مجال تھی کہ ان کی جسارت پر معترض ہوتا۔"

میری علالت ایک مخدوم زادے کی کرامت تھی

ڈاکٹر مصطفیٰ خاں صاحب اسسٹنٹ سول سرجن جو اعظم گڑھ میں مولانا کے معالج تھے، جن کے چند ہی روز کے علاج سے فائدہ محسوس ہونے لگا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا اسی اثنا میں گونڈہ تبادلہ ہو گیا، اور مولانا بھی ان سے علاج کرانے کے لئے گونڈہ روانہ ہو گئے۔ وہاں قاضی خادم حسین صاحب جو مولانا سید امیر علی صاحب شہید کی بہن کے نواسے ہیں، اور جن کے نانا وہیں وکیل تھے، وہ اس زمانے میں وہاں طالب علم تھے اور نوجوان تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ "میں مولانا کی تصنیفات پڑھ کر ان کی زیارت کا بے حد مشتاق تھا، مگر ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی۔ مولانا کے گونڈہ آنے کا حال سنا۔ عقیدت مندانہ حاضر ہوا اور شوقِ ملاقات عرض کیا۔" فرمانے لگے:۔

"اب مجھے معلوم ہوا کہ میری یہ علالت ایک مخدوم زادے کی کرامت تھی۔"

دوستوں سے چھیڑ چھاڑ

بزِ اخفش[1]

مولوی حافظ شاہ تجمل حسین صاحب (دسینوی بہاری) جو مولانا شبلی مرحوم کے ساتھی تھے اور بعض بعض مدرسوں میں ان کے رفیق تھے، ایک دفعہ لکھنؤ میں دونوں کی ملاقات ہوئی، اور بے تکلفی کی طالب علمانہ باتیں شروع ہو گئیں۔ مولانا نے حافظ سے فرمایا: "تم تو میرے شاگرد ہو میں نے تم کو قطبی (منطق کی ایک کتاب کا نام ہے) پڑھائی تھی۔" حافظ نے جواب دیا:۔

"تم مجھے قطبی پڑھاتے تھے کہ مجھ کو بزِ اخفش بنا کر اپنی منطق صاف کرتے تھے۔"

[1] بزِ اخفش (لفظی معنی اخفش کا بکرا) نافہم بے سمجھے بوجھے گردن ہلانے والا، ہاں میں ہاں ملانے والا کے لئے اردو میں

استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اخفش نے جو عربی کے علم نحو و صرف میں استاد کامل گزرا ہے، زمانۂ طالب علمی میں ایک بکرا پالا تھا، جس کو اپنے سبق کا مطلب سمجھایا کرتا تھا۔ جب تک یہ بکرا گردن نہ ہلا دیتا یا بول نہ اٹھتا، اخفش برابر سمجھاتا رہتا۔ عرصے کے بعد بکرے کو ذبح کیا تو دیکھا کہ دماغ خالی ہو گیا تھا۔ بھیجا باقی نہیں تھا۔

کشمیر اور بہشت میں اصل و نقل کا فرق

علی گڑھ کے دورانِ قیام میں ایک مرتبہ مولانا کو کشمیر کے سفر کا خیال ہوا۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولوی سمیع صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"میں انشاء اللہ اگر اچھا ہو گیا تو اسی مہینے میں کشمیر جاؤں گا۔ اور ڈیڑھ دو مہینہ وہاں رہوں گا۔ اگر تم کشمیر تک چلو، تو ضرور چلے آؤ۔ سفر کا خرچ جو تقریباً چالیس پچاس ہو گا۔ تمھارے ذمے۔ باقی اقامت کا خرچ میرے ذمے۔ علاوہ میری ہمراہی و ہمدردی کے کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نہیں۔ یہاں نہ دیکھا تو قیامت میں اگرچہ اس کا نمونہ دیکھنے میں آئے گا، مگر اصل و نقل میں پھر فرق ہے۔ کشمیر میں جانے سے ممکن ہے تمھارے ظاہری رنگ میں فرق آئے یعنی "نتواں شستن از زنگی سیاہی" غلط ہو جائے (واضح رہے کہ مولوی سمیع صاحب مرحوم کا رنگ اچھا خاصا سیاہ تھا)

دوستانہ شکایت کا انداز

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے شادی کی ہے۔ مولانا کو خبر ملتی ہے۔ اس کی مبارک باد دیتے ہیں اور شادی کی اطلاع نہ دینے کی دوستانہ شکایت لکھتے ہیں:۔

"مکرّمی! مبارک، مبارک، سلامت، سلامت، مگر حضرت یہ اکل کھرا پن کیسا؟ خبر تک نہ کی، دعوت میں بلانا تو بڑی بات ہے، خیر، خوش رہیئے، نیازمندوں کی خدمت بڑھ گئی یعنی ایک جان کے ساتھ دو جانوں کی سلامتی کی دعا فرض ٹھہری۔"

شاید بنارس میں رمضان تشریف نہ رکھتے ہوں گے

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مولانا کو رمضان کے مہینے میں بنارس سے اعظم گڈھ آنے کی خبر دی تھی اس سلسلے میں ان کو لکھتے ہیں:۔

"بنارس اور مرزاپور آپ کتنے دن رہے اور اعظم گڈھ کو رمضان پر ٹالا۔ شاید بنارس وغیرہ میں رمضان تشریف نہ رکھتے ہوں گے۔"

نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل!

مولانا ایک مرتبہ بمبئی میں ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھے یہیں سے ایک خط مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھا ہے اس میں مولانا کو اپنی ایک جدید فارسی غزل بھیجی ہے۔ جس کا قطعہ ہے

باش تا شبلی آزاد بہ زیبا صنمے۔ از در صومعہ ناکردہ ہم دوش آید۔ اس شعر کے بعد لکھتے ہیں:۔

"افسوس کہ ہم نہ صرف پارسائی میں بلکہ رندی میں بھی عالم بے عمل ہیں۔"

اعظم گڈھ منیٰ اور عرفات کی طرح کچہری کے زمانے میں آباد اور تعطیلوں میں ویران ہو جاتا ہے

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ایک مرتبہ چھٹیوں کے زمانے میں اعظم گڈھ آنے کو لکھا ہے۔ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

افسوس آپ ایسے وقت تشریف لاتے ہیں کہ اعظم گڈھ میں سناٹا ہوگا یہ شہر منیٰ اور عرفات کی طرح صرف کچہری کے زمانے تک آباد رہتا ہے تعطیلوں میں بالکل ویران ہو جاتا ہے۔"

اجمیر کی راہ میں لکھنؤ بھی آتا ہے!

مولانا ابوالکلام آزاد کے اجمیر جانے کی خبر ملی ہے۔ ایک خط میں اُن سے دریافت کرتے ہیں :۔

"اجمیر کب تک جایئے گا؟ جغرافیہ تو اس قدر ضرور معلوم ہوگا کہ اس راہ میں لکھنؤ بھی آتا ہے۔"

مولانا آزاد کے ندوہ نہ آنے کی معذرت پر مولانا شبلی کی برہمی

مولانا نے مولانا ابوالکلام آزاد کو کسی موقعے پر کلکتے سے ندوہ آنے کی دعوت دی ہے۔

انھوں نے کسی وجہ سے معذرت کی ہے۔ اُن کو لکھتے ہیں :۔

"اگر آپ اس موقعے پر نہ آئے، تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا۔ بلکہ بعدِ قیامت بھی۔"

حیدر آباد رہ کر انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے

مولوی حمید الدین صاحب بی۔ اے سے جو مولانا مرحوم کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد ہیں، خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہیں اور اپنی خاموشی کی وجہ کس خوبی سے بیان کرتے ہیں:

"افسوس! تم نے اس قدر مجھ سے بے تعلقی کر لی کہ تمہارے حالات مجھ کو بجائے اس کے کہ تم سے معلوم ہوں، اوروں سے دریافت کرنے پڑتے ہیں۔ شاید تم مجھ کو بھی اس الزام کا ملزم ٹھہراؤ، لیکن کیفیت یہ ہے کہ حیدر آباد رہ کر، انسان خدا کو بھول جاتا ہے، تا بہ آدم چہ رسد۔"

ایم مہدی حسن کو ان کی رفیقۂ حیات کے انتقال پر تعزیت

اردو کے مشہور انشا پرداز ایم مہدی حسن کی رفیقۂ حیات کے انتقال کی خبر سن کر ان کو تعزیت نامہ لکھا ہے۔ جس میں لکھتے ہیں:

"مدت کی پوچھ گچھ کے بعد پتہ لگا کہ آپ کا رفیق و ہمدم آپ سے چھوٹ گیا۔ مجھ کو بھی افسوس ہوا، لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ آپ جیسے فلسفیانہ مزاج آدمی کو اس مرحلے میں ذرا ثابت قدم

رہتا تھا۔ خیر، اب تو ناچار یہی کرنا، جو عقلاء پہلے ہی کرتے ہیں۔"

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

ایک جگہ مہدی حسن کے خطوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"مکرمی! عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کا تو خط بھی ایک دل چسپ آرٹیکل ہوتا ہے، لیکن اگر اس کی داد دوں، تو ہم دونوں "حاجی" ہوئے جاتے ہیں۔"

احرامِ جدید

ایم مہدی حسن کے عقدِ ثانی کی خبر سن کر ان کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کے احرامِ جدید کی داد دوں یا رشک کروں؟"

"ہم جیسے نفوسِ قدسیہ سے پردہ اور وہ بھی ساٹھ برس کے بعد!"

بیگم ایم مہدی حسن، مولانا سے پردہ کرتی تھیں اور مولانا کی شاعرانہ نظر ان کو بے حجابانہ دیکھنے کی مشتاق تھی، لیکن وہ دونوں کسی نہ کسی طرح پہلو بچا لیتے تھے۔ آخر دل کی بات بے اختیار نوکِ قلم پر آ ہی جاتی ہے:۔ "دوسرا تو آتا ہے، لیکن آپ یا بھاوج صاحبہ ہر دفعہ دامن بچا جاتے ہیں۔ ہم جیسے نفوسِ قدسیہ سے بھی پردہ! اور وہ بھی

ساٹھ برس کے بعد!!"

عطیہؒ کی روانگی سے پہلے کہیں چلے جانے کا مقصد

عطیہؒ بیگم ولایت تشریف لے جانی والی ہیں۔ دل تقاضا کرتا ہے کہ بمبئی جاکر خدا حافظ کہیں، لیکن جب رخصت کے سمے کا خیال آتا ہے، تو ہمّت نہیں پڑتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"باوجود اس کے کہ ولایت کی عین روانگی کے وقت بمبئی میں رہنا نہیں چاہتا تاہم چاہتا ہوں بمبئی آؤں اور روانگی سے سے پہلے اور کہیں چلا جاؤں"

مولانا شروانی کو تکمیلِ دیوان کا ایک پُرلطف مشورہ

مولانا شروانی نے اپنی چند غزلیں مولانا کو ملاحظے کے لئے بھیجی ہیں۔ ان کا ارادہ عقدِ ثانی کا ہے۔ اس سلسلے میں ان کو لکھتے ہیں:۔

"اگر دیوان پورا کرنا منظور ہے، تو وصال کی تاریخ ٹالتے جایئے۔ ورنہ ناسور بند ہو جائے گا۔"

ایمان بالحضور ایمان بالغیب کو کب پہنچ سکتا ہے

ایک جگہ مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

"ابنِ خلکان وغیرہ تو مدّت سے مجھ کو صاحبِ دل لکھتے اور

سمجھتے تھے۔ آپ نے آج سمجھا ہے، ایمان بالحضور ایمان بالغیب کو کب پہنچ سکتا ہے۔"

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

ایک جگہ مولانا ابوالکلام آزاد پر کیا لطیف طنز کرتے ہیں:۔

"مجھ کو بڑی شکایت آپ سے تلوّن مزاجی اور عدمِ استقلال کی تھی۔ ہائے اس مرتبہ آپ اپنی ناراضی پر پورے مستقل رہے اور اب تک ہیں۔"

لکھنؤ اور لکھنوی احباب سے محبّت

ایک بار کہیں مولوی مسعود علی صاحب نے مولانا کو جب وہ حیدرآباد میں تھے، لکھ دیا تھا کہ اب آپ کو لکھنؤ اور ہم لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے، اسی لیے ادھر کا رُخ نہیں کرتے۔ اس کے جواب میں اُن لوگوں کو لکھتے ہیں:۔

"کیا بات کہتے ہو کہ لکھنؤ اور تم لوگوں سے متنفّر ہو گیا ہوں۔ تو پھر جی کر کیا کروں گا۔"

نیا ثمر!

ایم مہدی حسن صاحب مولانا کے مخلص اور بے تکلّف احباب میں سے تھے۔ اُنھوں نے دوسری شادی کی تھی، مندرجۂ ذیل جملے میں کس لطیف پیرائے میں ان سے استفسار کرتے ہیں:۔

"بیگم صاحب سے کوئی نیا ثمر ہاتھ آیا یا نہیں؟"

"اس مذاق کا آدمی شعر العجم لکھ چکا!"

مولانا نے ایم مہدی حسن صاحب سے کسی شخص کے حسن و جمال کی تعریف کی تھی۔ اتفاقاً اس کی ایک نقلی تصویر ایم مہدی حسن صاحب کو کہیں سے ہاتھ لگ گئی، اور وہ تصویر انھوں نے مولانا کے پاس بھیج دی اس پر ان کو جھلا کر لکھتے ہیں:-

"استغفر اللہ! وہ تو کسی بیجا[1] یا لولو[2] کی تصویر ہے۔ آپ کے حسنِ ظن کی داد دیتا ہوں۔ اس مذاق کا آدمی شعر العجم لکھ چکا۔"

1۔ ناشائستہ ۔ 2۔ ایک ڈراؤنی شکل جو بچوں کو ڈرانے کے لئے بناتے ہیں۔

ایم مہدی حسن کے ایک خط کا پُرلطف جواب

ایم مہدی حسن صاحب نے کہیں مولانا کو اپنے خط میں لکھ دیا ہ
"کچھ دنوں آپ اور جوان رہتے"۔

"سبحان اللہ! تو گویا اب جوان ہوں، اور اگر اب جوان ہوں تو قسم لیجئے جو مرتے دم تک بوڑھا ہوں"۔

محرومِ دید!

بیگم ایم مہدی حسن کو بے پردہ دیکھنے کی آرزو بار بار شبلی کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ یہ سنہری موقع آیا بھی، مگر مہدی صاحب باوجود وعدہ کرنے کے چکما دے گئے اور طالب دیدار محرومِ دیدار ہی رہا۔

"واقعی سخت تعجب ہوا کہ آپ وعدہ کر کے میزبانی سے کترا گئے۔ خیر، کوئی مصلحت ہوگی"۔

حرم سے نامحرم!

ایک دوسری جگہ ایم مہدی حسن کو لکھتے ہیں :-

"حرم سے گو اب تک نامحرم ہوں، لیکن ایمان بالغیب کا سلام کہہ دیجئے۔"

ابھی تک تو میں انسان ہوں "

"الہلال" میں "کشاف" کے نام سے مولانا نے اپنی نظمیں شروع کی تھیں۔ جس پر نہایت شاندار اور بلیغ الفاظ میں تبصرہ کیا گیا تھا۔ اور "مشرق" میں ایک بلند پایہ مضمون مولانا کی نسبت لکھا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک جگہ ایم مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"کشاف" کی ہزلیات جو کچھ ہوں، اسی طرف رکھئے جن ظن کو آپنا کیوں بڑھاتے ہیں، اور بڑھانا ہی تھا، تو مطایبات، کا لقب زیادہ موزوں تھا۔ میری نسبت جو کچھ "مشرق" میں نکلا، نظر سے گزرا، لیکن وہی شکایت تو آپ سے بھی ہے۔ دونوں میری تصویر غلط کھینچتے ہیں ایک فرشتہ بناتا ہے۔ ایک دیو، لیکن ابھی تک تو میں انسان ہوں۔ ترقی و تنزل کی وہ دونوں منزلیں ابھی آگے ہیں۔"

حاضر جوابی

فرعونِ بے سامان اور فرعونِ باسامان

ایک مرتبہ مولانا بمبئی سے اجمیر کے راستے سے لوٹے۔ اجمیر کے اسٹیشن پر پہنچے تو مجاورجو اسٹیشن پر زائرین کو لینے کے لئے آتے ہیں، مولانا کی طرف بڑھے۔ مولانا نے اُن سے بے رخی برتی تو اُنھوں نے کہا کہ یہ حضرت فرعونِ بے سامان معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا:۔

"ہاں، میں فرعونِ بے سامان ہوں مگر آپ فرعونِ باسامان ہیں۔"

"جتنے ہیں سر ان پہ ہی فائق یہ سر"

مولانا شبلی کو مولانا محمدؒ فاروق صاحب چریا کوٹیؒ سے تلمذ حاصل تھا۔ اُستاد اور شاگرد میں رسمی تعلق نہ تھا، بلکہ غایت درجے کی دل بستگی اور مذاق کی یگانگت تھی۔ مندرجہ ذیل واقعے سے دونوں کی

بے تکلفی اور شبلی کی حاضر جوابی اور انانیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:۔
ایک مرتبہ مولانا شبلی ننگے سر بیٹھے تھے۔ اُستاد نے پیچھے سے آکر سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور مذاق سے کہا:۔

ہاں ہر گا چپت گاہِ خلائق یہ سر

شاگرد نے فوراً جواب دیا:۔

جتنے ہیں سر، ان پہ ہے فائق یہ سر

"مشاعرے سے پہلے غزل نہیں سنائی جاتی"

مولانا کو اس کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ تکمیل واشاعت سے پہلے ان کی کتابت کا مسودہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ سر سیّد مرحوم "الفاروق" کا مسودہ اور چھپے ہوئے اجزا دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے اور وہ مسکرا کر یہ جواب دیتے:۔

"مشاعرے سے پہلے غزل نہیں سنائی جاتی۔"

ختم شُد

ایس جالب مظاہری
اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول
محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳
۶۱-۱۱-۲۳

کتابیات

۱۔ مقالاتِ شبلی حصّہ اوّل	از مولانا شبلی
۲۔ مقالاتِ شبلی حصّہ دوم	" "
۳۔ مقالاتِ شبلی حصّہ سوم	" "
۴۔ مقالاتِ شبلی حصّہ چہارم	" "
۵۔ حیاتِ شبلی	" سیّد سلیمان ندوی
۶۔ خطوطِ شبلی بنام عطیہ بیگم و زہرہ بیگم	" مولوی محمد امین صاحب زبیری
۷۔ کلّیاتِ شبلی	" مولانا شبلی
۸۔ مکاتیبِ شبلی حصّہ اول	" مولانا شبلی
۹۔ مکاتیبِ شبلی حصّہ دوم	" مولانا شبلی
۱۰۔ شبلی نامہ	" شیخ محمد اکرم
۱۱۔ شبلی کی حیاتِ معاشقہ	" وحید قریشی
۱۲۔ افاداتِ مہدی	" بیگم مہدی
۱۳۔ مکاتیبِ مہدی	" بیگم مہدی
۱۴۔ سفرنامۂ روم و شام	" مولانا شبلی
۱۵۔ شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	" عبداللّطیف اعظمی
۱۶۔ مطالعۂ شبلی	" سجّاد علی سندیلوی
۱۷۔ موازنۂ انیس و دبیر	" مولانا شبلی

چند معیاری مطبوعات

۱-	ممتاز القواعد	(فارسی)	ایس جالب مظاہری	۲-۵۰
۲-	نذرِ وطن	(چینی حملے کے خلاف نظموں کا مجموعہ)	دور آفریدی	۱-۷۵
۳-	اندازِ نظر	(تنقیدی مضامین)	صفیہ اختر	۲-۰
۴-	زیرِ لب	(صفیہ اختر کے خطوط جاں نثار اختر کے نام)		۶-۰
۵-	حرف آشنا	(دوسرا مجموعہ)	"	۴-۰
۶-	کائناتِ تبسم	(مزاحیہ مضامین)	شوکت تھانوی	۳-۵۰
۷-	نیلم	(ناول)	قیسی رامپوری	۴-۵۰
۸-	پیامِ مشرق		علامہ اقبال	۴-۵۰
۹-	خیانت	(ناول)	قیسی رامپوری	۳-۰
۱۰-	دوشیزہ	"	"	۲-۵۰
۱۱-	چمن زار	(مجموعہ کلام)	نکہت شاہجہانپوری	۳-۰
۱۲-	خیاباں	"	محمود اسرائیلی	۳-۵۰
۱۳-	انوارِ دانش	"	"	۲-۰
۱۴-	اپنے خواب	(افسانے)	کاظم علی دہلوی	۲-۲۵
۱۵-	جنتِ نگاہ	"	فدا علی خنجر	۲-۲۵
۱۶-	تصورات	"	ایم اسلم	۲-۲۵
۱۷-	بکھرے ہوئے تارے	"	حق نواز خاں	۵۰
۱۸-	کلیاتِ سعدی	(فارسی)	سعدی	۰
۱۹-	یوسف زلیخا	"	جامی	۵۶

علوی بک ڈپو - محمد علی روڈ - بمبئی ۳